نیا اڈیشن

صنفِ انشائیہ

اور

چند انشائیے

(مع پیش لفظ از سیّد احتشام حسین)

ڈاکٹر سیّد محمد حسنین

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

ناشر

ایوان اُردو، پٹنہ ۴
بہار

مطبوعہ
دی آزاد پریس۔ سبزی باغ پٹنہ ۴

بار اوّل ... ... اگست ۱۹۵۸ء
بار دوم ... ... اکتوبر ۱۹۶۳ء

قیمت
چار روپے
Rs 4.00

عرض ناشر

زیر نگاہ مجموعہ مضمون کی ایک مخصوص صورت کا تعارف ہے اور اس کا نمائندہ بھی۔ یہ صورت ادب کی ایک نئی اور دل کش صنف "انشائیہ" ہے۔

اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس سے پہلے اس صنف پہ ایسی جامع، عالمانہ اور واضح نگاہ نہ ڈالی گئی تھی۔ انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر سید محمد حسنین کا بصیرت افروز اور پُر مغز مقالہ ہمارے ادبی شعور کی ایک بند دریچی کھول دیتا ہے۔ اس مقالہ میں ادبی اور غیر ادبی تحریروں کی جیسی شناخت کرائی گئی ہے اور فن و معیار کی جیسی اہم قدریں موصوف نے ہمارے سامنے رکھی ہیں اس کا اندازہ اس کے مطالعہ سے ہو سکے گا۔

آج کے نئے لکھنے والوں کے لئے خصوصاً یہ مجموعہ چراغِ راہ کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جنھیں کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے ان کے لئے یہ مجموعہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اردو میں افسانہ نگاری اور تنقید نگاری ترقی کے بہت اونچے مدارج طے کر چکی ہے۔ ان اصناف میں نو مشقوں کے لئے اب کوئی جگہ بنانی آسان نہیں۔ انشائیہ نگاری اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے۔ مغربی ادبوں میں Light Essays بہت ہی معروف ہیں اور وہاں انشائیہ ادب کی ایک مقبول عام صنف میں شمار ہے۔ ہمارے نئے لکھنے والے اگر انشائیہ نگاری کی طرف متوجہ ہوں تو اس صنف میں انھیں نام اور مقام پیدا کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

یہ مجموعہ بی۔اے پاس اور آنرس طلباء کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قدر دان ادب اسے پسند فرمائیں گے اور یونیورسٹیاں اسے اپنے نصاب میں داخل کر کے ناشر کی ہمت افزائی کریں گی۔

دیوان چند جین

نیا اڈیشن

صنف انشائیہ اور چند انشائیے کے اس اڈیشن کو پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی ہے کہ اردو دنیا میں یہ مجموعہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں نے اس مجموعہ کو ادب اردو کے نصاب میں داخل کیا۔ اردو کے موقر رسالوں نے اس پر تبصرہ کیا اور معزز ادیبوں نے اسے پسند کرتے ہوئے اپنی مفید اور گراں قدر رائے بھیجی۔ اظہار کردہ ان تاثرات کو بصورت "تقریظات" اس اشاعت میں شائع کر رہے ہیں۔ ان تمام اردو دوست حضرات کی اس نوازش اور کرم کے ہم بے حد ممنون ہیں۔

افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود اس مجموعہ کو خاطر خواہ چھاپ نہ سکے۔

دیوان چند جین

اکتوبر ۱۹۶۳ء

ترتیب

انتساب ... ...

پیش لفظ ... ... پروفیسر سید احتشام حسین

صنف انشائیہ ... ...

چند انشائیے ... ...

نمبر شمار	عنوان	انشائیہ نگار	صفحہ
۱	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	محمد حسین آزادؔ	۳۹
۲	گلشنِ امید کی بہار	”	۴۸
۳	نہیں	عبدالحلیم شررؔ	۵۵
۴	ہم	”	۶۵
۵	آلکھیری	خواجہ حسن نظامی	۷۲
۶	جھینگر کا جنازہ	”	۷۶
۷	پِٹنا	مرزا فرحت اللہ بیگ	۸۰
۸	مردہ بدست زندہ	”	۸۹
۹	قانونِ زندگی ...	ملا رموزی	۹۹
۱۰	غنودگی ...	”	۱۰۷
۱۱	ارہر کا کھیت ...	رشید احمد صدیقی	۱۱۴
۱۲	پاسبان ...	”	۱۲۵

نمبر شمار	عنوان	انشائیہ نگار	صفحہ
۱۳	چار سو بیس ...	حاجی لق لق	۱۴۰
۱۴	وہ آ گئیں ...	"	۱۴۸
۱۵	آنریری مجسٹریٹ	انجم مانپوری	۱۵۲
۱۶	دوستی ...	"	۱۷۳
۱۷	کتّے ...	پطرس	۱۹۱
۱۸	سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی	"	۱۹۹
۱۹	مشینوں کی موت	فلک پیما	۲۱۱
۲۰	نئی دُکان ...	"	۲۲۰
۲۱	غسلیات ...	کرشن چندر	۲۲۶
۲۲	رونا	"	۲۳۴
۲۳	اخبار بینی ...	کنھیا لال کپور	۲۴۱
۲۴	اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے	"	۲۴۷
۲۵	تکلفات ...	شوکت تھانوی	۲۵۶
۲۶	بابو	"	۲۶۶
۲۷	موٹر سائیکل ...	شاہ علی اکبر قاصد	۲۷۶
۲۸	چھینک ...	"	۲۸۱
	تقریظات		۲۸۹

کنھیّا لال کپور کے نام

پیش لفظ

اگر میں یہ پیش لفظ اس اعتراف سے شروع کروں کہ میرے ذہن میں انشائیہ کی کوئی منطقی اور علمی تعریف نہیں ہے تو یقیناً مجھ پر لاعلمی اور جہالت کا الزام نہیں لگایا جائے گا کیونکہ میں خود ان تمام مشرقی اور مغربی نقادوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں جنھوں نے قطعیت کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اسی کو صحیح اور مناسب ترین قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ میرے ذہن میں انشائیہ کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ یہ تصوّر کسی منطقی تعریف کی شکل میں نہیں، ایک علمی تاثّر کی شکل میں میری ذہنی گرہ کے اُفق پر جھلملاتا رہتا ہے اور جب میں اسے لفظوں میں اسیر کرنا چاہتا ہوں تو وہ گرفت میں نہیں آتا۔ شاید یہی فرق ایک علمی یا معلوماتی مضمون اور انشائیہ میں بھی ہو۔ ایک میں قطعیت، استدلالی انداز، معلوماتی بیرنگی اور نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے اور دوسرے میں افکار و مسائل کی تاثراتی رنگینی۔ اس لئے میں یہ غلطی نہیں کروں گا کہ انشائیہ کی کوئی تعریف پیش کروں۔ اس کام میں کچھ ادیب مجھ سے زیادہ مستعدی اور لگن کے ساتھ منہمک ہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے اُردو کے کچھ ادیب خاص طور سے انشائیہ کے حدود متعین کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ان میں سے بعض نے خود بھی انشائیے لکھے ہیں اور گویا اس بات کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے کہ ان کے خیال میں انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ذوق اور تصوّر کے مطابق انشائیے لکھ رہے ہیں، لیکن اس فکر میں نہیں ہیں کہ وہ انشائیہ کی تعریف بھی کریں۔ یہ وہ ہوشیار لوگ ہیں جن کو آم کھانے سے کام ہے، گٹھلیاں گننے کا کام دوسروں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں یا اکبر الہ آبادی کی زبان میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

جو طریق کار بھی زیادہ محتاط اور محفوظ ہو، کسی نہ کسی کو تو یہ کام بھی کرنا ہی ہے کہ وہ مختلف اصناف ادب میں سے اس صنف کو چھانٹ کر الگ کرے جسے عرف عام میں انشائیہ کہا جاتا ہے اور جب اس کی شکل صورت پہچانی جانے لگے تو اچھے اور بُرے انشائیوں کے حسن و قبح پر غور کرنے کے طریقے بھی بتائے۔ یہ کام ڈاکٹر سیّد محمد حسنین نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے دو درجن سے زیادہ انشائیوں کا انتخاب کر کے اس پر ایک معلوماتی اور دل چسپ مقدمہ لکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ اُردو میں بھی کچھ اچھّے انشائیے لکھے گئے ہیں اور ان انشائیوں کو مضمون، مقالہ، روداد، اداریہ، خاکہ، رپوتاژ، صحافتی مضامین اور روزنامچہ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ کوشش مستحسن ہے اگرچہ اس سے بھی بحث کے وہ تمام دروازے بند نہیں ہوتے جو نقّادانہ موشگافیوں سے کھلتے ہیں اور مغرب و مشرق کے نقاد جن کے حل کرنے میں

لگے ہوئے ہیں۔

انشائیہ محض ذاتی تاثر ہے یا فلسفیانہ خیال آرائی، محض انشا پردازی کا طلسم ہے یا معنی خیز اظہارِ خیال، محض سرسری اور سادہ اظہارِ تاثر ہے یا رنگین اور فکر خیز ادبی تخلیق —— اس طرح کی بہت سی نازک بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور اب تک کوئی آخری بات اس سلسلہ میں نہیں کہی گئی ہے۔ اگر کسی نے بحث مباحثہ کے بعد کوئی نتیجہ نکال بھی لیا ہے تو اس پر پورے ہونے والے صرف چند مضامین ملے ہیں جنھیں اس نے اپنے نقطۂ نظر والے انشائیوں کی فہرست میں شریک کرنا مناسب سمجھا اور بات محض ذاتی پسند کی ہو کر رہ گئی۔

اگر کسی کو اس بحث سے دل چسپی ہو تو وہ وزیر آغا کی خیال پارے، نظیر صدیقی کی کتاب تاثرات و تعصّبات، انھیں کا مجموعۂ مضامین شہرت کی خاطر، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا انتخاب اُردو ایسیز، مولوی صفی مرتضیٰ کی کتاب اُردو انشائیہ اور ادیب علی گڈھ کے انشائیہ نمبر (مرتبہ قمر رئیس) کا مطالعہ کرے۔ اس کی سمجھ میں کم سے کم بحث کے وہ سارے پہلو سامنے آجائیں گے جن کے جاننے کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ انشائیہ کی کوئی ایسی حد بندی نہیں ہونی چاہئے جو اچھے، خیال انگیز، ادیبانہ اور ذہنی آسودگی بخشنے والے ادب پاروں کو صرف اس بنا پر اس صنف میں شامل نہ ہونے دے کہ اس میں کوئی مخصوص بات، جو کسی لغت یا کتاب

میں انشائیہ کے بارے میں بتائی گئی ہے، نہیں ملتی۔ انشائیہ کی حدبندی کے باوجود ڈاکٹر سیّد محمد حسنین نے یہ مصنوعی اور خود ساختہ انداز انتخاب اختیار نہیں کیا ہے اور بہت سے اچھے مضامین یکجا کر دیئے ہیں تاکہ طلبار کو اچھی نثر کے شگفتہ نمونوں سے واقفیت ہو جائے۔

ان کا یہ انتخاب ایک بار شایع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ دوسرے اڈیشن کے لئے انھوں نے مقدّمہ میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی سعی کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے انشائیہ کے طالبعلموں کا یہ مقصد پورا ہوگا۔

پروفیسر سیّد احتشام حسین

صنفِ انشائیہ

مضمون اور انشائیہ

۷۱ انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے ۔ یہ اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب ایک مخصوص صنفی مقام کا مستحق ہے ۔ ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، عام زبان میں "مضمون" سے موسوم کر دیا جاتا ہے ۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے ۔ اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظ "کہانی" میں ہے ۔ آپ کے زیرِ مطالعہ سب رس ہو یا حکایت لقمان، باغ و بہار ہو یا فردوس بریں، رستم و سہراب ہو یا اخری تحفہ یا سحرالبیان، آپ غور کریں ہر تصنیف میں آپ اساسی طور پر کسی قصہ یا واقعہ سے دوچار ہوتے ہیں ۔ بلاشبہ، ان میں قصے کی نوعیت مختلف ہے ۔ ان کا رنگ روپ اور وضع قطع مختلف ہے ۔ مگر ان تصنیفات میں ایک بنیادی عنصر موجود ہے، جو کہانی ہے ۔ اس لحاظ سے ان مختلف تحریروں کو کہانی سے موسوم کرنا حق بجانب ہے ۔ ادب کی اصطلاح میں مگر ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا ۔ کہانی ہوتی ہوئی بھی یہ صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ان میں سے ہر تحریر کو بالترتیب ہم ان ناموں سے منسوب کرتے ہیں :۔ تمثیلیہ (allegory)،

حکایت (fable)، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ کہانی کی یہ مختلف صورتیں ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں۔

یہی حال مضمون کا ہے۔ لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول اور عامیانہ لفظ ہے۔ اس کے دائرے میں بہت ساری باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل نوعیتوں کی تحریریں ملاحظہ ہوں:—

(۱) عزیز و اقربا کے نام کے خطوط، (۲) کسی موضوع پر سنجیدہ فکر آرائی، (۳) کسی موضوع پر حزن آگیں تمثیلی اظہار، (۴) کسی بڑے انسان کی حیات کا ایک رُخ، (۵) روزناموں اور رسالوں کے ایڈیٹوریل، (۶) جلسوں کی رپورٹ، (۷) ڈائری کا ایک صفحہ، (۸) کسی دل چسپ شخصیت کا مرقع، (۹) کسی موضوع پر لطیف و شگفتہ بیان، (۱۰) کسی ادبی یا ثقافتی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ——— مذکورہ بالا نوع کی تحریریں بہ اطمینان و آسانی "مضمون" سے موسوم ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ نامناسب ہے۔ ایک متعلم ادب کا ان تحریروں کو محض مضمون قرار دینا اس کے مطالعۂ ادب کا قصور ہے۔ یہ مختلف النّوع تحریریں نثر سے متعلق ہیں۔ اختصار ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر تحریر اپنی صورت اور مزاج کے بموجب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان میں موضوع اور اسلوب (matter & manner) یعنی روح اور قالب کا فرق ہے۔ یہی اختلاف اور یہی فرق ادب میں ان کے مخصوص مرتبہ و مقام کا اصل سبب ہے۔ مذکورہ بالا نوع کی تحریریں ادبی اور صنفی لحاظ سے بالترتیب ان ناموں سے منسوب کی جاتی ہیں:— (۱) مراسلہ، (۲) مقالہ، (۳) کیفیہ، (۴) سوانح یا سرگزشت، (۵) اداریہ، (۶) روئداد، (۷) روزنامچہ، (۸) خاکہ، (۹) انشائیہ، (۱۰) رپوتاژ۔

انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے۔ سطحی طور پر یہ بالکل درست ہے۔ پر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خبر و خیریت ملتی ہو یا مقالہ کی فکر خیز بصارت۔ جس میں کیفیہ کی رقت خیزی ہو یا سوانح کے تاریخ وار کارنامے۔ جس میں روئداد کی خشک کارروائیوں کا ذکر ہو یا روزنامچہ کے غیر متعلق بے ربط بیانات۔ جس میں خاکہ کے رخ روشن کی تابانی نظر آئے یا رپوتاژ کی پر اثر طائر نگاہی۔ مراسلہ، مقالہ، کیفیہ، سوانح، روئداد، روزنامچہ، خاکہ اور رپوتاژ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ایسی مخصوص تحریری صورتیں ہیں جنھیں ہم "اصناف ادب" کا مرتبہ دیتے ہیں ——— ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک خاص صورت ہے اور نثری ادب میں اس کا اپنا ایک صنفی مقام ہے۔ انشائیہ کو اس لئے محض ایک "مضمون" خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ مضمون نویسی چھوٹے بچوں یا اسکول کے لڑکوں کا شغل ہے۔ یہ شغل ادیب کے لئے موزوں نہیں۔

صنف مقالہ

انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت ہے یا صنف ہے۔ ادب کے دیگر اصناف میں اس کا رشتہ مقالہ سے قریب ہے۔ کہانوی اصناف یعنی تمثیلیہ، حکایت، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہ اعتبار صنف، اس کا موازنہ مقالہ سے کیا جا سکتا ہے۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور دیانت ہوتی ہے۔ مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ حکمت و فلسفہ یا علم و دانش کے کسی پہلو یا رخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اس کے دائرے میں ادب،

علوم اور سائنس کے حکیمانہ، عالمانہ اور فاضلانہ امور کے لئے پوری گنجائش ہے۔ یہ باتیں
یا اس نوع کی تمام سنجیدہ باتیں بڑی اہم ہیں۔ ان سے ہماری شناسائی ضروری ہے۔
ان کی خشکی، دشوار فہمی یا بے کیفی کے پیش نظر ہم ان کی قدر و قیمت سے ہرگز انکار نہیں
کر سکتے۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ علوم اور سائنس سے ہماری لاعلمی یا بے تعلق
ہمارے لئے موت کا سبب ہوگی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص ان سے گریز نہیں کر سکتا۔ علوم
اور سائنس سے دور بہ کر وہ وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار و ترقی سے یقیناً دور
ہو جائے گا ——— مقالے، اچھے اور مفید مقالے، اس اہم مقصد میں ہمارے
کام آتے ہیں۔ یہ ہمیں وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار اور ترقی کے ساتھ لے چلتے ہیں۔
ایک مثال سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو جائے گی۔

آج روس کا اسپٹنک انسان کی ذہنی کاوش کا ایک سب سے حیرت ناک
اور جیتا جاگتا کرشمہ نظر آتا ہے۔ ہم سے سیکڑوں میل کی بلندی پر کرۂ ارض اور مختلف
سیاروں کے درمیان نیلگوں خلاء میں انسان کا تخلیق کردہ محض چند فٹ کا یہ مصنوعی چاند
قدرت کے دیگر اجسام فلکی کی طرح اپنے قائم کردہ مدار پر گردش کرتا رہتا ہے۔ کتنی
استعجاب انگیز اور عقل میں نہ سمانے والی بات ہے یہ!

لیکن، یہ بات ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ عقل کو اسے سمجھانا ضروری ہے۔ ہم
روس یا امریکہ کے اسپٹنک کو ماہ نخشب یا جام جمشید جیسی فرضی شئے قرار نہیں دے
سکتے۔ ایسا خیال کرنا ہماری حماقت کی دلیل ہوگی۔ آج کا انسان اس حیرت ناک
ایجاد کو سوچ سوچ کر دم بخود ہے۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں اس مصنوعی چاند کی ایک
جھلک دیکھنے کو نہ جانے کتنی بار آسمان پر بیتابانہ اٹھی ہیں۔ ہمارا ہوشمند دماغ اس

عینی صداقت کو سمجھنے کے لئے پریشان اور بے کل رہا ہے۔ یہ کیسا چاند ہے؟ کس طرح یہ گردش کرتا ہے؟ کون سی طاقت اسے سطح زمین سے ہزاروں میل کی بلندی پر پہنچا دیتی ہے؟ اس میں ایک ذی حیات مخلوق کا زندہ رہنا، زمین والوں سے سلسلۂ کلام جاری رکھنا اور پھر نایاب مشاہدات لے کر جائے قیام پر واپس آجانا، کس قدر عجیب اور کتنی حیرت فزا سچائی ہے! اس قسم کے سوالات، عقل میں نہ سمانے والے بے شمار سوالات، ہمارے دماغ میں چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک سادہ سا مقالہ ہماری آسودگی کا سبب بن جاتا ہے۔ طبیعیات، فلکیات اور دیگر متعلقہ سائنٹیفک مضامین کے پس منظر میں اس موضوع پر ایک مختصر سی تحریر کے مطالعہ سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جانا یقینی ہے۔ اسپٹنک پر ایک اچھا سا معلوماتی مقالہ ہمارے ذہن کی ایک بند دریچی کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے ——— آپ غور کریں اس نوع کی تحریر ہمارے لئے کتنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ ایک ناقابل فہم اور دشوار بات جو بے حد سنجیدہ ہے، سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ یہی سنجیدگی مقالوں کی روح ہے۔

یہ مثال ایک علمی مقالہ کی تھی جس کی روح سائنس کے چند اونچے نکات سے معمور تھی۔ اسی طرح دیگر سنجیدہ امور بھی مقالوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ ملک کا تیسرا پنج سالہ پلان ہو یا کالجوں میں مذہبی تعلیم کی اہمیت، ڈی۔ وی۔ سی کے زرعی امکانات ہوں یا نظریۂ حیات بعد الموت، نالندہ کی ثقافتی زندگی کی ایک جھلک ہو یا اشتراکیت میں انفرادی آزادی ——— یہ، یا اس قسم کی کوئی علمی بات مقالوں کا موضوع ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ادب، فن، شاعری اور تنقید جیسے ادبی امور بھی بخوبی مقالوں میں پیش

کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ذی علم اہل قلم ان عنوانات پر سیر حاصل بحث کر سکتا ہے۔ ذی علم سے مراد خواندہ محض نہیں، بلکہ ایسا شخص جس کی ان دشوار اور ادق باتوں پر اچھی خاصی نگاہ ہے اور جس کا اپنا مطالعہ بھی ہے۔ اس کے مطالعہ میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہوگی، مقالہ میں اسی قدر وزن اور استحکام ہوگا۔

اچھے مقالہ نگار کے لئے دو شرائط ضروری ہیں، عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج۔ اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔ بڑے اور فاضل مقالہ نگار کی شخصیت کا پہلا رُخ عالم کا ہوتا ہے اور دوسرا انشاء پرداز کا۔ وہ صرف بلند و اعلیٰ اور اہم و ادق سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا، بلکہ عام فہم اور دل نشیں انداز سے پیش کر کے اسے نا قابلِ قبول بھی بنا دیتا ہے۔

مقالوں میں حکمت و فلسفہ، علم و دانش یا سائنس کی ادق و ارفع باتیں سپردِ قلم کی جاتی ہیں۔ اس سپردگی میں، مگر عالم، مفکر یا سائنٹسٹ کی روش اختیار نہیں کی جاتی۔ مقالوں کی زبان اور اسلوب صاف اور دل کش ہوتا ہے۔ یہاں باتیں علوم اور سائنس کے عجیب و غریب اشارات اور وضع و مصطلحات کے بل بوتے پر نہیں چلتیں، بلکہ یہ ادبی رنگ روغن رکھتی ہیں۔ باتوں کی خشکی، بے کیفی اور سنجیدگی پر مجاز و تمثیل کا ہلکا سا چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے۔ ان چھینٹوں سے تحریر میں تر و تازگی اور شیفتگی آ جاتی ہے۔ یہ مقالوں کی زبان اور اسلوب کا سبب ہے کہ ان ادق اور ارفع باتوں کو بلا درد سر ہم ذہنی طور پر بہت کم عرصۂ وقت میں قبول کر لیتے ہیں۔

مقالہ اور انشائیہ

مقالہ کی روح سنجیدگی اور متانت ہے۔ مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف و شفاف ہوتی ہے۔ اس کی تیز شعاعوں سے نفسِ تحریر کے مختلف گوشے منوّر و نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوعِ تحریر یا نفسِ مضمون سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں ——————

انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن یہ روشنی رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اس میں دھندلکا اور برّاقی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہماری توجہ کو ایک ہی راستے پر نہیں لگاتیں، بلکہ یہ اسے اٹھکیلیاں کراتی ہیں۔ مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں۔ ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گوناگوں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شئے پالیتے ہیں۔ ایسی شئے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔ ایسی شئے، جو ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔

آپ جانتے ہیں، یہ دنیا حیوانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں شیطان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ زندگی اور خوش گوار زندگی کو، لیکن انسانوں کی حاجت ہے اور انسان کا انسان بن کر انسانیت کا انداز کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسانی قدروں کی تمیز اور پہچان کے لئے فرزانگی کی ضرورت ہے اور یہ فرزانگی تھوڑی سی حیوانیت سے بڑے مزے میں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انشائیہ بہت مفید ہے۔ یہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں

حیوان بنا دیتا ہے جس سے ہماری انسانیت میں چستی اور توانائی آجاتی ہے -

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے - اس سے ہم میں متانت، ضبط اور سلیقہ آتا ہے ۔ انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے - اس سے ہم میں رندی اور آوارہ خیالی آتی ہے - مقالوں کی سنجیدگی اور نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے - اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی آوارگی یا بدمستی ہی دور کر سکتی ہے - مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے اور انشائیوں میں تاثرات کا - مقالوں کا کام فکر انگیزی ہے اور انشائیوں کا کیف انگیزی -

مقالہ نگار ایک معلم ادب ہوتا ہے - اس کا کام درس و تدریس ہے - اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں - وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے - اس میں متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے - اس کا شیوہ لفاظی نہیں - وہ جو جانتا ہے، کہتا ہے اور جتنا جانتا ہے، سناتا ہے - وہ ہمیں گمراہ نہیں کرتا ــــــ انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے - وہ غیر سنجیدہ بات کہتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ پر کہتا ہے - وہ جتنا جانتا ہے، اس سے زیادہ سناتا ہے - لیکن اس کی باتیں لاحاصل بکواس نہیں - یہ مفید اور کارآمد ہوتی ہیں - یہ ہماری فہم و ادراک کو منجمد ہونے سے بچاتی ہیں - ان سے ہمارے طائر تخیل کو پر لگتے ہیں - انشائیہ نگار کی گپیں ہماری قوت تمیز پر ٹھوکریں لگاتی ہیں - یہ ہم پر ان تازیانوں جیسا کام کرتی ہیں جن کی نرم چوٹیں سہہ کر ہم زیادہ ہوشمند، زیادہ روشن خیال اور زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں -

مقالہ اور انشائیہ دونوں نثری ادب کے اصناف ہیں - مقالوں کی

روحانی تربیت، مگر ادب سنجیدہ[1] انجام دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے۔ انشائیوں کی شریعت و طریقت کا حساب، اس کے برخلاف، ادب لطیف کے ذمہ ہوتا ہے۔

ادب لطیف اور انشائیہ

انشائیہ کو "ادب لطیف" یا "انشائے لطیف" جیسی مصطلحات سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نامزدگی صحیح نہیں۔ یہ اسی طرح نامناسب ہے جیسے ہمارا اور آپ کا "حیوان" جیسے عامیانہ لفظ سے یاد کیا جانا ——— آپ اتفاق کریں گے کہ ہم حیوان کی ایک قسم ہیں اور مخصوص قسم۔ کارخانۂ قدرت کے اس ارضِ بسیط پر ہمارا مرتبہ و مقام "انسان" کا ہے، چرند یا پرند یا دوسرے حیوان کا نہیں ——— اسی طرح، انشائیہ بھی ادب لطیف ہے۔ "پر" یہ ادب لطیف کی ایک خاص صورت ہے۔ زبان و ادب کے پس منظر میں اور ادب لطیف کے مختلف اصناف کے پیش نظر انشائیہ کو ہم ایک مخصوص صنفی مقام دیتے ہیں۔ ادب میں اس کا رشتہ ادب لطیف سے ہے اور یہ رشتہ بڑا قریبی ہے۔ ادب سنجیدہ سے اس صنف کا تعلق محض کہنے کو ہے۔ ادب لطیف اور ادب سنجیدہ کا اجمالی بیان اس جگہ نامناسب نہ ہوگا کہ اس کے پیش نگاہ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

ہر زبان و ادب کے دو حصے ہوتے ہیں، ادب لطیف اور ادب سنجیدہ۔

---

[1] ادب لطیف اور ادب سنجیدہ کا بیان آگے آئے گا۔

انگریزی میں ان کے لئے Serious اور Light literature
literature مستعمل ہے۔ ادب لطیف میں شعری اور نثری اصناف داخل ہیں
اور ادب سنجیدہ میں علوم اور سائنس۔ عمرانیات، فلسفہ، تاریخ، معاشیات اور
نفسیات کا تعلق علوم سے ہے اور طبیعیات، فلکیات، نباتیات اور حیوانیات وغیرہ
کا سائنس سے۔ یہ سارے علمی اور سائنٹیفک مضامین اپنی سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی
کے بموجب ادب سنجیدہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ادب لطیف کے شعری اصناف میں
غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی اور نظم وغیرہ شمار ہیں اور نثری اصناف میں
داستان، ڈراما، ناول، افسانہ، خاکہ، سوانح، مقالہ اور انشائیہ وغیرہ
داخل ہیں۔

ادب لطیف زبان وادب کا وہ حصہ ہے جس میں علوم اور سائنس کا گذر
نہیں۔ یہ انسان، مہذب ومتمدن انسان، کی وہ حسّی وذہنی تحریری کاوشیں ہیں جو
تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان میں نہ علوم اور سائنس جیسی سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ
ان کی جیسی خشک بیانی۔ ادب لطیف کی باتیں نرم، نازک اور لطیف ہوتی ہیں۔
یہ ہمارے دل ودماغ سے سنجیدگی کی طالب نہیں ہوتیں۔ یہ براہ راست ہمارے
احساس کو چھوتی ہیں۔ ہمارے جذبات وتخیلات سے یہ رشتہ رکھتی ہیں اور ہمیں
نت نئے کوائف سے ہمکنار کردیتی ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ادب لطیف زبان وادب کا ایک حصہ ہے۔ یہ کاخ ادب
کی ایک منزل ہے، کوئی مخصوص کمرہ نہیں۔ یہ ادب کی ایک شاخ ہے، تحریر کی کوئی
خاص صورت نہیں ——— لیکن عام طور پر اسے ایسا نہیں سمجھا جاتا۔ ادب لطیف

سے مراد ایک خاص رنگ اور لب و لہجہ کی تحریریں لی جاتی ہیں جو "نیازیت" یا "ٹیگوریت" کی مثال ہوتی ہیں۔ یہ وہ شاعری کہی جاتی ہے جو اپنی ساری جمالیاتی قدروں کے ساتھ نثر میں قلمبند کی جاتی ہے۔ یہ کسی شدید داخلی پُر از ہیجان کیفیت کی رقّت انگیز و درد آگین ترجمانی کرتی ہے۔ روح اور قالب یعنی موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ تحریریں رومانی ہوتی ہیں —— ایک زمانہ میں اس نوع کی تحریروں کا ہمارے ادب میں بڑا چرچا تھا۔ "انشائے لطیف" یا ادب لطیف جیسے نام پر ہمارے نوخیز ادب نوازان نگارشات کے لئے جان دیتے تھے۔

بلاشبہ، یہ تحریریں اپنی نیم گفتنی یا لذت آگین ابہام کے بموجب اپنی ایک خاص شکل رکھتی ہیں۔ مگر یہ شوخ رنگ و پُر از آہنگ تحریریں، اگر ادب میں صنفی لحاظ سے کسی مقام پانے کی مستحق ہیں بھی، تو بے نام و نشان رہیں۔ دیگر اصناف ادب مختلف ناموں سے نامزد ہوئے، پر ان کا کوئی نام نہ پڑ سکا۔ اپنے نومشق قلم کاروں کے ہاتھ یہ بدنام رہیں اور گمنام مریں۔ آسانی کے لئے ان تحریروں[1] کو ہم "کیفیہ" سے یاد رکھیں گے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کیفیہ وہ پھل تھا جو پکنے سے پہلے سڑ گیا۔

---

[1] کیفستان از اکبر حیدری، نغمات موت از حجاب اسماعیل، یادِ رفتگان از ہمشیرہ مشرف حسین اور پرچھائیاں اور اس کا دوسرا رخ از آصف علی جیسی تصنیفات اس نوع کی تحریروں کا قابل مطالعہ مجموعہ ہیں۔

تو، انشائیہ کو ادب لطیف یا کیفیہ سے موسوم کرنا حماقت ہے۔ ادب لطیف میں وہ تمام نثری اور شعری تحریریں داخل ہیں جو تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ جن میں احساسات، جذبات اور تخیلات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مشاہدات و تجربات سے بھرپور تحریریں اپنی مخصوص وضع و قطع یا شکل و صورت رکھتی ہیں اور ہم انھیں اصناف ادب یعنی Literary forms کے نام سے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ان ہی اصناف میں ایک صورت ان رومانی تحریروں کی ہے جنھیں میں نے کیفیہ کا نام دیا ہے اور جو نثر کی شاعری کہی جاتی ہے۔

انشائیہ نگار کا تعلق ادب سنجیدہ سے نہیں ہوتا، ادب لطیف سے ہوتا ہے اور یہ تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمّہ ہوتا ہے۔ اس کی زبان اور دماغ دونوں شاعر کے ہوتے ہیں، مفکر یا سائنٹسٹ کے نہیں ہوتے۔ وہ ادب لطیف کی خاک سے ہوتا ہے اور اسی کی خاک اڑاتا ہے۔ لیکن اس گہرے تعلق سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ادب سنجیدہ کی سرحدیں اس کے لئے آؤٹ آف باونڈ ہوتی ہیں یا فلسفہ و حکمت، علوم اور سائنس جیسے شعبہائے ادب سنجیدہ کے پاس انشائیہ نگار کا پھٹکنا بھی محال ہے۔ وہ ادب کے ہر شعبہ اور زندگی کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ آزاد و خود مختار ہے۔ یہ ساقیٔ محفلِ خاص ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ عارفِ عرش نشیں بھی ہوتا ہے۔ ہاں، ادب سنجیدہ کی وادیٔ سنگلاخ و دشوار گذار میں انشائیہ نگار کے لئے ٹھہرنا مشکل ہے۔ یہ اس کا مسکن نہیں۔ وہ صرف ادب سنجیدہ کی جھلکیاں لے سکتا ہے۔ اس کی خوش طبعی فلسفہ د

حکمت اور علوم اور سائنس کی ٹھوس اور مجرّد صداقتوں کا سامنا نہیں کر سکتی۔

انشائیہ میں داخلیت

انشائیہ میں داخلیت یعنی Subjectivity کا ہونا شرط ہے۔ یہ داخلیت انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات کی غماز ہوتی ہے۔ یہ اس کے مشاہدہ، کثرتِ مشاہدہ، کا ثبوت دیتی۔ یہ داخلیت مجرّد نہیں ہوتی۔ یہ خارجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی اور شگفتہ بیانی ہے۔ اس فرض سے عہدہ برا ہونے کے لئے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا، بلکہ وہ پرائے دل دماغ کے پاس بھی جا پہنچتا ہے۔ اس کی باتیں رنگارنگ ہوتی ہیں۔ یہ ذاتی ہوتی ہوئی بھی پرائی بو باس لے کر آتی ہیں۔ اچھے اور معیاری انشائیوں میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے ایک شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی شگفتگی ہوتی ہے جو وقتی نہیں ہوتی۔ اس کی تر و تازگی کو ثبات حاصل ہوتا ہے اور یہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔

داخلیت ہمیں کیفیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اس صنف کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ پر، کیفیہ کی داخلیت تیز اور پُر سوز ہوتی ہے۔ یہ براہ راست قلب تک اُتر جاتی ہے اور روح میں ایک لذت انگیز اضطراب اور ناقابلِ بیان کسک پیدا کر دیتی ہے۔ انشائیہ کی داخلیت اس قدر رقیق اور شدید نہیں ہوتی۔ انشائیہ اور کیفیہ دونوں اصناف اپنی نوعیت کے بموجب تاثراتی ہوتے ہیں۔ لیکن، اول الذکر میں دھوپ چھاؤں کی بہار ہوتی ہے اور لیل و نہار کا سماں بھی۔ کیفیہ میں، اس کے برخلاف، صرف نمودِ سحر کی پاکیزگی نظر آتی ہے یا تاروں کی تنک تابی۔

کیفیہ میں ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے - مگر انشائیہ سے پڑھنے والوں کو وہ خمار میسّر ہوتا ہے جس کی لہریں چڑھتی اور اترتی رہتی ہیں - کیفیہ نثر کی شاعری ہے جس میں انگریزی صنف شاعری (Ballad) جیسی بات ہوتی ہے - انشائیہ نثر کی غزل ہے جس کا ہر جرعہ ایک نیا کیف اور نیا سرور بخشتا ہے - انشائیہ کی داخلیت صرف ہمارے دل کو نہیں چھیڑتی ' یہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے - یہاں وارداتِ قلب سے کہیں زیادہ محشرِ خیال کا جادو چلتا ہے -

---

صحیفہ نگاری اور انشائیہ نگاری

انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی پابندی نہیں - "He can catch hold of any thing and can make some thing out of nothing." یہی اس کی منفرد شان ہے - چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات' ہر ادا اور ہر کیفیت اس کی زد میں آ سکتی ہے - اپنی افتادِ طبع اور شگفتہ نگاری سے وہ ہر بے بات کی بات میں "کچھ بات" پیدا کر دے سکتا ہے —— آپ کہیں گے' کچھ بات پیدا کر دینا ایک اچھے صحافی کے لئے بھی کوئی دشوار بات نہیں - وہ بھی ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ کسی موضوع پر موثر انداز میں بہت کچھ لکھ سکتا ہے -

مجھے آپ سے اتفاق ہے - یہ صحیح ہے کہ صحافی بھی موضوع کا پابند نہیں ہوتا - بے بات کی بات پیدا کر دینا یا بات کا بتنگڑ بنا دینا صحیفہ نگاری کی ایک شان ہے - اس لحاظ سے انشائیہ نگار کی طرح وہ بھی آزاد ہے - مگر دونوں میں فرق ہے اور بنیادی فرق

ہے۔ انشائیہ نگار کا ضمیر پاک ہوتا ہے۔ صحافی کے یہاں یہ طہارت نفس ممکن نہیں۔ اس کی تحریروں پر ایک چھاپ ہوتی ہے جو کسی مسلک یا پالیسی کی چھاپ ہے۔ یہ چھاپ ہلکی ہوتی ہے جسے ہماری نگاہیں نہیں، عقل دیکھ سکتی ہے۔ اداریئے اور شذرات ہیں، خواہ یہ روزناموں کے ہوں یا ماہناموں کے، پڑھنے والوں کو ہم خیال و ہم مشرب بنانے کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔ انشائیہ میں دل کا یہ چور نظر نہیں آتا۔ انشائیہ نگار کا دل صاف اور بے لوث ہوتا ہے۔ اس کا اپنا نہ کوئی سوچا سمجھا مسلک ہوتا ہے اور نہ یہ کسی پالیسی کا اسیر ہوتا ہے۔ یہ بالکل آزاد رہتا ہے اور خود مختار۔ اس کی قلم کاری پر کوئی سنسر نہیں۔

صحافی کی باتوں میں سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی ہوتی ہے۔ یہ باتیں، مگر عامیانہ اور سطحی ہوتی ہیں۔ ان میں مقالہ جیسی گہرائی یا پائداری نہیں ہوتی۔ اچھا صحافی جیک اف آل ہوتا ہے، ماسٹر اف ون نہیں ہوتا۔ اچھا مقالہ نگار ماسٹر اف ون ہوتا ہے، جیک اف آل نہیں ہوتا۔ یہ کنواں جیسا گہرا ہوتا ہے، پھیلا ہوا پانی نہیں ہوتا —— انشائیہ نگار بھی جیک اف آل ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ اس کی باتوں میں مگر نہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ اس پر کوئی چھاپ رہتی ہے۔ اچھا انشائیہ ایک بہتا ہوا دھارا ہے، رواں دواں اور جولاں۔

صحافی بھی مقالہ نگار کی طرح دعوت فکر دیتا ہے۔ پر، اس کی باتوں میں عموماً کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان میں دینے کے ساتھ لینے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے، دوسروں کو ہم مشرب و ہم خیال بنا لینے کی صلاحیت۔ صحافی بے غرض و بے مطلب قلم نہیں اٹھاتا اور نہ دیانت کے ساتھ قلم چلاتا ہے۔ وہ اپنے کام کی بات لکھتا ہے اور باتوں میں کتر بیونت کو جائز اور خورد برد کو روا قرار دیتا ہے۔ مقالہ نگار کو، اس کے برخلاف،

دیانت سے واسطہ رکھنا ہوتا ہے - اعجاز اس کی عادت نہیں ——— انشائیہ نگار ہمیں دیتا ہے، ہم سے کچھ مانگتا نہیں - اس کی باتوں میں سوال یا طلب کا لہجہ نہیں ہوتا - وہ ہمیں آسودگی بخشتا ہے اور شگفتہ کرتا ہے -

الغرض انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی پابندی نہیں - وہ بالکل آزاد اور خود مختار ہوتا ہے - اسے کوئی روک ٹوک نہیں - وہ ہر جگہ جا سکتا ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے - شرط کیف و اثر ہے، کیونکہ بات کا تبنگڑ بنانا اس کا شیوہ نہیں - اسے دل سے سروکار رکھنا پڑتا ہے، دماغ یا "دماغ والوں" سے نہیں - وہ کو الف بخشتا ہے، انکار نہیں دیتا - وہ گپ کرتا ہے، درس نہیں دیتا - وہ دل بہلاتا ہے، دل کا درد نہیں ابھارتا - اس کا کام خوش گفتاری ہے، مسلک و آئین کی تبلیغ و اشاعت نہیں - اس کا طائر آزاد و پر فشاں رہتا ہے -

سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر دینا اور غیر سنجیدہ کو سنجیدہ بنا دینا، معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کی نیرنگیٔ نظر کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— وہ پارلیمنٹ کو اڈہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کے نوا ہائے سمع خراش کو طرحی غزلیں! وہ اسپٹنک کو محبوبۂ تفوئ شکن کی ڈولی بنا سکتا ہے اور خوش نصیب لائکا کو جرنل ڈی گاؤلے!

قصہ گوئی اور انشائیہ نگاری

انشائیہ میں قصہ گوئی کا گذر نہیں - اس کی شریعت میں "کہانو بت" کفر ہے - عام طور پر انشائیہ کو ہم ایک پُرلطف قصہ یا دلچسپ واقعہ خیال کرتے ہیں - یہ بالکل

غلط ہے۔ انشائیہ نثری ادب سے متعلق ہے۔ یہ "مضمون" کے دائرے میں سما سکتا ہے، پر یہ "کہانی" کے حلقہ میں جگہ نہیں پا سکتا۔ ادب میں قصہ گوئی یا واقعہ نگاری کے لئے مختلف اصناف مقرر ہیں۔ یہ اصناف کہانی کی مختلف بھرپور، کمل اور خوش نما صورتیں ہیں جن کی تشکیل و تعمیر میں فنّی لوازمات کا لحاظ لازمی ہے۔ یہ اصناف تمثیلیہ، حکایت، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی سے موسوم ہیں۔ کہانی لکھنے یا پڑھنے کے لئے ہمارا ان اصناف سے رجوع کرنا لازمی ہے۔ ادب میں ان کے علاوہ، کہانی یا قصہ کے لئے کسی مزید صنفی شکل کا کوئی وجود نہیں۔

تو، انشائیہ "کہانی" کی شکل نہیں۔ اس کی مقبولیت اور دل کشی کا سبب نہ قصہ گوئی ہے اور نہ واقعہ نگاری۔ یہ وہ صنف ادب ہے جو محض غیر سنجیدہ خیالات اور ذاتی تاثرات کی ترجمانی کے لئے وقف ہے۔ کہانی یا قصہ یا واقعہ کی پیشکش کے لئے یہ صنف بالکل ناموزوں ہے۔ اس صنف میں کہانی کو جگہ دینا گویا گلاس میں بجائے پینی یا بلانی ہے۔

ہر کہانی کی تشکیل و تعمیر کے لئے چند اجزا کا استعمال لازمی ہے — ادبی اصطلاح میں یہ اجزائے ترکیبی "اجزائے ثلاثہ" کہے جاتے ہیں۔ یہ تین اجزا پلاٹ، کردار اور مکان و زمان ہیں۔ انگریزی میں ان کے لئے Plot, Character, Space and time جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ کہانوی[1] اصناف کی تعمیر اجزائے ثلاثہ کے بغیر ناممکن ہے —— انشائیہ میں، مگر اجزائے ثلاثہ کا استعمال

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "کہانوی ادب" مطبوعہ نیا دور لکھنؤ، شمارہ جون ۱۹۶۲ء۔

کسی حال میں بھی جائز نہیں - انشائیہ کی روح تاثرات ہے، غیر سنجیدہ و ذاتی تاثرات-
کہانی کا مغز پلاٹ یا ماجرا ہے، طویل یا مختصر پلاٹ - انشائیہ میں خیالات کی بے ربطی یا
بے ترتیبی ہوتی ہے - کہانی میں، اس کے برعکس، خیالات کا گذر نہیں - یہاں قصہ یا واقعہ
کا دخل ہے اور اس قصہ یا واقعہ میں بھی ربط، ترتیب اور توازن شرط اوّلین ہے -
انشائیہ کی دل کشی کی اصلی وجہ انتشار خیال یا ذہنی آوارگی ہے - کہانی کی کامیابی کا
راز، اس کے برخلاف، اتحاد خیال میں مضمر ہوتا ہے - انشائیہ میں تاثرات کی بوقلمونی
نظر آتی ہے اور کہانی میں واقعات، حادثات اور سانحات کا تنوّع ہوتا ہے -

انشائیہ میں واقعہ سے مصرف لیا جاسکتا ہے، مگر واقعہ نگاری سے قلم آلودہ نہیں
کیا جاسکتا - انشائیہ نگار واقعہ کا چراغ جلا سکتا ہے، پر منظّم و مربوط واقعات سے
حسن چراغاں نہیں کر سکتا ——— آپ جانتے ہیں کہ ہر واقعہ میں، خواہ یہ چھوٹا سے
چھوٹا کیوں نہ ہو، بے شمار ناہموار سالم و غیر سالم ٹکڑے ہوتے ہیں - یہ ٹکڑے بیکار و مہمل
نہیں کہ انفرادی طور پر ان کا کوئی وجود نہیں - ادب میں ان کی جزوی اہمیت سے انکار
مشکل ہے - ان واقعاتی ننھے ننھے ٹکڑوں کو ہم عام طور پر "لطیفوں و چٹکلوں" کے نام سے
یاد کرتے ہیں - ادب میں ان کا اصطلاحی نام "محاظرات" ہے - انشائیہ میں محاظرات کی قدر و
قیمت بڑی اہم ہے - یہ اسی قدر اہم ہیں جتنی پرتکلف دستر خوان پر انواع اقسام چٹنیاں -
محاظرات کے استعمال، مناسب استعمال سے انشائیہ کی رنگارنگی میں اضافہ ہوجاتا ہے -
محاظرات سے لگے لپٹے جو نہایت خفیف و لطیف اثرات ہوتے ہیں اور ان کی ناہمواری
میں جو ادھوری حیرت فزا کیفیتیں ہوتی ہیں، قلب انشائیہ میں سما کر یہ باتوں کو زیادہ
شگفتہ اور زیادہ دل گیر بنا دیتی ہیں - ان کے مصرف سے انشائیہ کی بہار میں بھی ایک نکھار

آجاتا ہے۔

اسی طرح اس صنف میں سیرت نگاری کا بھی موقع نہیں۔ تخلیق شخصیت یا مرقع نگاری انشائیہ نگار کا کام نہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمارے سامنے خاکہ نگار کی ذات آتی ہے۔ انشائیہ میں شخصیت یا انفرادیت کے نقوش وجلووں سے کام نکالا جاسکتا ہے، مگر انھیں مرکزی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ یہ نقوش وجلوے یہاں ذیلی مقام رکھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کہانوی اصناف میں ایک نہایت ہی قوی مگر خفیف مادہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں "مرکزی خیال" یا "بنیادی خیال" یعنی Theme کہتے ہیں۔ ہر افسانہ، ڈراما یا ناول میں کسی نہ کسی مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے۔ مطالعہ سے پہلے ہم اس سے لاعلم ہوتے ہیں، مگر مطالعہ کے بعد ہم پر یہ عیاں ہوجاتا ہے۔ یہ اسی بنیادی خیال کی کشش اور قوت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کہانی کے اجزائے ثلاثہ میں ایک گہرا ربط قائم ہوجاتا ہے۔ پلاٹ، کردار اور مکان وزمان میں اس سے ایسی اکائی پیدا ہوجاتی ہے جو مجموعی طور پر اجزائے ثلاثہ کے اتحاد کا سبب بن جاتی ہے ——— انشائیہ میں اس اکائی یا اتحاد کا مطلق گذر نہیں۔ کیونکہ اس میں بنیادی خیال سے قلم کار کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ کسی بنیادی خیال کی پھولی پھلی شکل نہیں۔ اس کی کامیابی کا راز تاثرات کا اتحاد نہیں، ان کی بوقلمونی ہے۔

مزاح نگاری اور انشائیہ

اس صنف کو مزاح نگاری سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری

قرار دینا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے ۔ مزاح نگاری، ہجو نگاری، المیہ نگاری یا رومان نگاری قلم کاری کی مختلف ادائیں ہیں ۔ یہ تحریروں کی صورتیں نہیں ۔ ادبی نگارشات میں ان کی نوعیت توصیفی ہوتی ہے، صنفی نہیں ہوتی ۔

تحریروں کا اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب کوئی خاص صورت اختیار کر لینا ایک بات ہے اور ان میں کسی خاص رنگ کا پایا جانا اور بات ہے ۔ ادبی تحریروں کو ہمیں صنفی لحاظ سے دیکھنا چاہئے اور ادب پارہ یا اصناف ادب سمجھ کر انھیں جانچنا اور پرکھنا چاہئے ۔ تحریروں کی ادبی شناخت کی یہ پہلی منزل ہے ۔ افسوس ہے، اگر ہم اس بنیادی بات سے ہی لاعلم ہیں ۔

تو، مزاح نگاری ایک وصف ہے، صنف نہیں ۔ یہ قلم کار کی فطرت یا طبع کی ایک خصوصیت ہے، ادب پارہ نہیں ۔ یہ وصف یا خصوصیت نثری تحریروں میں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور شعری تحریروں میں بھی ـــــــ مزاح کو میں انشائیہ کا جوہرِ اعظم خیال کرتا ہوں ۔ یہ انشائیہ نگار کی سیرت کا خمیر ہے اور یہی اس کی قلم کاری کا رنگ روغن ۔ کیفیہ نگار کی طرح وہ محزون یا قنوطی نہیں ہوتا ۔ زندہ دلی اس کا مسلک ہے، خوش طبعی اس کی عادت اور شگفتہ بیانی اس کا مذاق ۔ انشائیہ نگار سیلانی ہوتا ہے، خفقانی نہیں ہوتا ۔ اس کی وحشت میں غمناکی نہیں طربناکی ہوتی ہے ۔ وہ سودائی بن سکتا ہے، پر مجنون نہیں ہو سکتا ۔ وہ صحرا نوردی کر سکتا ہے، سر نہیں پھوڑ سکتا ۔

اس صنف میں نہ واسوخت جیسی سوختگی و بیزاری ملتی ہے اور نہ مرثیہ جیسی سینہ کوبی و نوحہ خوانی ـــــــ انشائیہ نگار کے لئے رجائیت نعمت ہے اور قنوطیت لعنت ۔ یہاں نہیں رونے رلانے کے مواقع نہیں ملتے، ہنسنے ہنسانے کے بہانے

ملتے ہیں۔ انشائیہ میں مزاح[1] کی دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں، ظرافت اور ہجو یعنی Humour and satire یہ انشائیہ کے دو شوخ اور نہایت چٹکیلے رنگ ہیں۔ اس کی زعفران زار زمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب مواقع میسّر ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا بڑا عام ہے، مگر اپنے پر دوسروں کو ہنسانا آسان نہیں۔ اس کے لئے ہمت اور قربانی کی ضرورت ہے۔ انشائیہ کی یہ رنگی دوسروں کی حماقت اور اپنی خفّت دونوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بیک نگاہ یہاں آنکھوں کے تنکوں کے ساتھ بڑی بڑی شہتیریں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اچھے اور معیاری انشائیے سے اصلی ہنسی اور کھسیانی دونوں میسّر ہوتی ہے۔

ظرافت اور ہجو سے انشائیہ کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ انشائیہ کے وہ رنگ ہیں جس سے اس کی فضا میں دھر کھیلی برپا ہو جاتی ہے۔ یہ دھول خیالات سے اڑائی جاتی ہے، یہ دھول دھپّا کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ظرافت کے لئے بالغ ذہن، نفیس طبیعت اور شائستہ مزاج کا ہونا شرط ہے، ورنہ ظرافت میں بھانڈپن اور سوقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ ظرافت نامطابق خیالات سے پیدا کی جاتی ہے، نامطابق واقعات سے نہیں پیدا کی جاتی۔ انشائیہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے۔ پر، سینگ لگا کر لاتیں چلانی قابل تعریف نہیں، بلکہ سینگوں کے بغیر بیل بن جانا یا بنا دینا قابل تعریف ہے۔ اچھے انشائیوں میں ظرافت و ہجو کے رنگ نہایت پختہ

---

[1] مزاح ایک عام لفظ ہے۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ مثلاً — مذاق، بذلہ، مضحک، چہل، چلبلاپن، دل لگی، ٹھٹّا، ٹھٹول، مسخراپن، لطیفہ، چٹکلہ وغیرہ۔

ہوتے ہیں - یہاں ہجو کا دور رس اور ظرافت کا بلند پایہ ہونا لازمی ہے - یہ ظرافت اور ہجو کی معانی خیز لطافت کا سبب ہوتا ہے کہ ہنستے ہنستے ہم جیسے کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں -

---

انشائیہ کی تعریف

ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے - صنفی اور فنی لحاظ سے یہ "ادب پارہ" ہمارے یہاں نو وارد ہے، اور اس لئے یہ محتاج تعارف ہے اور محتاج تعریف بھی - انگریزی تعریفوں میں مجھے جانسن کا فقرہ بہت موزوں اور جامع نظر آتا ہے - اس صنف ادب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ـــــ "It is a loose salley of mind..." یعنی انشائیہ ذہن کی ایک "ترنگ" ہے ـــــ لفظ ترنگ انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے - وہ روح جس میں جولانی ہے، سوز نہیں - جس میں انتشار ہے، پراگندگی نہیں - وہ روح جو دل کے ساتھ دماغ کو بھی چھیڑ دیتی ہے -

انشائیہ ذہن، بالغ و پختہ ذہن، کی ایک ترنگ ہے، آزاد و پُر نوا، جیسے مقدس محفلِ سماع میں کسی اہلِ کیف کا ایک نعرہ بے اختیار - انشائیہ کے لطف و دل کشی کا اصل راز حکمت و حماقت کا اتّصال ہے - یہ حیوانیت اور ملوکیت کا امتزاج ہے - کہا جاتا ہے کہ فرشتے کبھی نہیں ہنستے - یہ مُسکرانا بھی نہیں جانتے - مگر شیاطین ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں کہ یہ ان کی تباہ کاریوں کا پھل ہوتا ہے - انسان، اس کے خلاف، ہنسنے کی لذّت جانتا ہے - یہ کبھی کبھی ہنستا ہے اور دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ

وہ اپنے آپ پر بھی ہنس دیتا ہے۔

انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سُنائی نہیں ہوتی ہے۔ اس میں آپ بیتی اور پرائی بیتی دونوں کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے جو کبھی کبھی چلتی ہیں اور دبے پاؤں آتی ہیں۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی "پھلجھڑی" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اُردو میں انشائیہ نگاری

نثری ادب کے نووارد اصناف میں خاکہ اور رپورتاژ کی طرح انشائیہ بھی ایک نئی صنف ہے۔ ادھر پچھلے چار پانچ برسوں سے اس موضوع پر مختلف طور پر کام ہوئے ہیں۔ انشائیوں کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ انشائیہ سے متعلق کئی مقالے لکھے گئے ہیں۔ دو ایک جگہ اس صنفِ ادب پر تحقیقی کام بھی کیا گیا ہے۔

اُردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی نے ادب میں روشناس کرایا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ راقم کے کالج کے ساتھیوں میں ایک صاحب سید شاہ علی اکبر قاصد[1] تھے۔ قاصد مرحوم کو اظہارِ خیال پر بڑی قدرت حاصل تھی اور یہ شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے۔ ڈی ایچ لارنس کی تحریروں پر جان

---

[1] نہایت حسرت و افسوس کی بات ہے کہ یہ نوجوان اہلِ قلم اچانک اپریل ۱۹۴۲ء کو پاکستان میں وفات پا گیا۔

دیتے تھے اور حمد و نعت بہت خوش الحانی سے پڑھتے تھے - ادب انگریزی کے لایق
پروفیسر محمد فضل الرحمٰن مرحوم اور ڈاکٹر اختر اورینوی کے لکچرس کی روشنی میں انھیں
اس خطۂ ادب کی گلگشتی میں بڑا لطف ملا - ان کی دیگر دلچسپیاں اس عروس نو کے
عشق پر قربان ہو گئیں - انھوں نے کئی چھوٹے ہلکے پھلکے نہایت ہی دل کش مضامین
لکھے - ترنگ ان کے مضامین کا مجموعہ تھا، جو مکتبۂ خیال، سبزی باغ پٹنہ، سے شائع
ہوا تھا۔

ترنگ میں اختر صاحب کا مقدمہ بھی تھا - یہ مقدمہ صنف انشائیہ پر اُردو کا
پہلا مقالہ تھا - لفظ انشائیہ فاضل مقدمہ نگار کی طبّاعی کا نتیجہ تھا - اُردو دنیا اس نوع
کی تحریروں سے ناواقف نہ تھی، مگر یہ لفظ بالکل نامانوس تھا اور اسے قبول عام کی سند
حاصل نہ تھی - ان دنوں بلکہ کئی سال تک صنفی لحاظ سے بھی انشائیہ محتاج تعارف تھا -
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نوع کی ہلکی پھلکی غیر سنجیدہ تحریروں کی نامزدگی اور
حدبندی میں پہلا نام ڈاکٹر اختر اورینوی کا سامنے آتا ہے -

انشائیہ کو ہم عام طور پر ایک پُر لطف اور جاذب توجہ تحریر سمجھتے ہیں اور
اسے ایک دلچسپ ادبی مضمون قرار دیتے ہیں - ادب انسان، مہذب و متمدّن
انسان، کی حسّی و ذہنی کاوشوں کا تحریری عکس ہے - یہ بے شمار سر سبز و بے شکل
نباتات کا سدا بہار خطِ استوا نہیں - ہم ادب کو نگارشات کا 'جنگل' نہیں کہہ
سکتے - دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ تحریر[1] معنوی حسن و دل کشی کے باوجود

---

[1] تفصیل کے لئے راقم کا مقالہ مطبوعہ نگار اگست ۱۹۶۰ء ملاحظہ ہو۔

ادب میں اپنی کوئی جگہ نہیں بنا سکتی ——— ادب زندہ اور صحت مند ادب میں تحریریں اپنی مخصوص شکل و صورت اور وضع قطع رکھتی ہیں۔ خیال کو محض تحریری جامہ میں ملبوس کر دینا نہ ادب ہے نہ قلم کاری۔ قلم کاری جو آرٹ یا فن کی عظمت رکھتی ہے، محسوسات کی صورت گری ہے۔ یہ ایسی صورت گری ہے جس میں مصوّری کی نیرنگی، موسیقی کا ترنّم اور رقص کا توازن ہوتا ہے ——— انشائیہ تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے جس کی ادب میں ایک صنفی حیثیت ہے۔ یہ قلم کاری کا ایک نمونہ ہے، حسین اور دل کش نمونہ۔

اُردو زبان و ادب کے اس دورِ زبوں حال میں جب ہماری عزت و آبرو محض 'مشاعرے' رہ گئے ہیں، یہ بڑی امید افزا علامت ہے کہ ہمارے اہل قلم اور ارباب نقد انشائیہ کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان دنوں نئی پود انشائیہ نگاری میں دل چسپی لے رہی ہے۔ یہ کھُلی حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والوں کے لئے اس وقت اس صنف ادب میں نام اور مقام حاصل کرنے کے لئے اچھے اور احسن مواقع حاصل ہیں۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہد قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہسواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہو گی۔ مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشہ و جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بُری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش نژاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبول لے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگ جاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ

راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم بنے رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی نید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے، تابعدار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے، دوست محبت کا بندہ ہے، اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک۔ انھیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمود دیئے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروّت سے غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دور دور تک پھیل گئی ہے، بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی خود اس مردار سے متنفر ہیں۔ وہ اس کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شئے پر دل آجاتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا، اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی

نہیں سُنتے۔ اِس کان سُنتے ہیں اور اُس کان نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچّوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزّت دوام کا تاج مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں مسخرا اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اُسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیّت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑکی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اُٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اسی واسطے بلند اُٹھی، اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے فتح و اقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا وہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لئے تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ بے اوسان تھے۔ کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اس کے یار و وفادار تھے اور کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اُس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کا حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طرّاری کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔

غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی بادہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا۔ کیونکہ حق کی کمان سے جب تیرِ نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں، اس لئے دھوکہ بازی اور شبہہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک سڑک تیار کرو۔ مگر اس طرح کے اینچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی رستے سے جدھر چاہتا تھا

نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دُنیا پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا تھا اور آپ فوراً کِھسک جاتا۔ وہ اس نرمانروائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کرکے ہٹتے تھے۔ پھر اِدھر ملکہ نے منہ پھیرا، اُدھر باغی ہوگئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوتی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے، جو بات سُنیں گے اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گذارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی، مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری نہ تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بدعملی ہوگئی۔ کیوں کہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہرچند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیوں کہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا۔ مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کے نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب

سب طرح سے نا امید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، انھیں میں رہا کریں۔ اپنے کیے کی آپ سزا پا لیں گے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دُنیا سے اُٹھا تو جہان اندھیرا اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔ اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے:—

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں روائی میں ہر دلعزیزی نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے۔ جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔

بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہیئے کہ جس طرح ہوسکے اپنی سختی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے۔ کیوں کہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہوجاتے ہیں۔ انھیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن نے صلاح کرکے ملکہ کے طرز لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحتِ زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیبِ بدن کرکے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو رستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گذرانتے۔ ادھر اس کا دخل ہوا اُدھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اُترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور ذاتی حُسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کرکے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لئے مضر سمجھنے

لگتے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے زرق برق کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھُل جاتی ہے۔

نیرنگ خیال

گلشنِ اُمید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں۔ مگر زمین جس قدر تخم امید کو پرورش کرتی ہے، اُسی کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کماتی ہیں یا بمقتضائے سِن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اُس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالتِ موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بد حال بھی ہو سکتی ہے، اسی وقت سے اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر

سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید کا ہونا ہر حالت میں ضروری ہے۔ یہ وہ ضروری شئے ہے کہ دُنیا کی بہتر سے بہتر حالت میں بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گذارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے ؎

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر اُمیدِ وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے اور ان باتوں کی توقع پیدا کر دیتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی ہوتی ہے، تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔ میں ایک رات انھیں خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانۂ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے اُمید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔ یکایک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے، تمام عالم رنگین و شاداب ہے۔ ہر چمن

رنگ و روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سر تا پا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لُطف زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے، چمکیلے پھول کھلے ہیں۔ آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جِھلمل جِھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی آواز سے بولتے سُنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر یہاں سے جو نظر اُٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی کہ دیکھا سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اٹھایا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا، زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیوں کہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں، وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھُرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں مگر تو بھی ہاتھ نہ آ سکیں۔ گویا میرے شوق آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی

جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دم بدم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہوگیا مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلتے چلو۔ جو نعمتیں ڈھکا رہی ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ میں آ جائیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا جس میں زن و مرد، خورد و کلاں بہت سے آدمی اُچھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اس کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا، نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو بتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمئ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزومند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انھیں اس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتا گیا۔ آخر ایک بوڑھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بوڑھے کو اب کیا ہوس ہوگئی ہے۔ اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا "صاحب دق نہ کیجئے۔ آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے

وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البال سے
مالا مال ہو جائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار بیچارے ٹیکس اور محصول
کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے۔ بلکہ فلک کے سیمرغ جو
اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں وہ بھی بازو ڈال آرام سے
بیٹھ جائیں گے۔" میں نے بڑھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا اور
وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمیت شکل اور آہستگی
رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے مگر جب میں اس کی طرف
بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا "اگر آپ کی خدمت کی فرصت
ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اسی خوشی کا ہوش نہیں۔ کیوں کہ بیس
برس سے میں ایک عہدے کی امیدواری کر رہا تھا، اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔"
میں نے اسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی
میراث پر قبضہ کرے کیوں کہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے
پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا۔ اس نے ایک غوطہ
خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اس کے دریائے منافع میں ایک غوطہ مارا چاہتا
تھا۔ یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔

ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم
ہوا کہ وہ طول البلد اور عرض البلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکار عالم
سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو یہ سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا

بے حاصل ہے، اب جو اپنی آنکھ کھلے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا اور آزادی کے عالم میں مُسکراتا چلا جاتا ہے۔ اُسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سُنایا۔ وہ ہنسا اور کہا۔ صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں یہ ملکۂ اُمید کا باغ ہے۔ وہ ملکۂ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوش نما اور نفیس نفیس چیزیں لئے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور وشور مچاتے دیکھا، یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالی شان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزار جوانی عین بہار پر ہے سرِ تخت جلوہ گر ہے مسکراہٹ اس کے زیر لب پارہ کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر، تاجِ مرصّع، موتیوں کے ہار، خلعتِ زرنگار کشتیوں میں چُنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہارِ زندگی کے پھولوں کا فرش بچھا ہے۔ عیش مدام اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے اور اسی بھروسہ پہ ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست

اور بے حقیقت تھی مگر ہرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ دیواریں لپی ہوئیں، دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا "قناعت کا آرام گھر" بعضے تھکے ماندے ان میں چلے آتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ راستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

نیرنگ خیال

نہیں

عجیب زبان ہے۔ جن لوگوں نے مختلف زبانوں کے لغات میں زندگی صرف کی ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ بعض الفاظ متضاد معنی رکھتے ہیں۔ خصوص عربی لغت کی کتاب میں تو اس قسم کے لغات اضداد سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لفظ بھی اپنے آثار کے لحاظ سے ہمیں اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک طرف تو مشہور ہے کہ "ایک نہیں سے سو بلائیں ٹلتی ہیں" اور دوسری طرف اہل غرض خصوصاً ہمارے ملک کے بڑے شوقی آرزومند عاشق مزاجوں کو روز ہی تجربہ ہوجایا کرتا ہے کہ ایک نہیں سے اُن پر کیسی کیسی مایوسیاں طاری ہوجاتی ہیں اور کتنی بڑی بڑی نا امیدیاں مبتلائے آفت کر دیتی ہیں۔ کسی کی زبان سے "نہیں" نکلا اور وہ بیتاب ہو گئے۔ کسی نے روکھی صورت بنا کر سر ہلا کے زبان سے "اُہوں" کہا اور انھوں نے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیا۔

غور سے دیکھئے تو دونوں جہتیں اپنے موقعے پر مزے کی ہیں۔

بے مزہ کوئی نہیں - پہلی جہت لیجئے جس سے سو بلائیں ٹلتی ہیں، بالکل ٹھیک، مثل مشہور ہے "کردن صد عیب و نہ کردن یک عیب"۔ نہ کردن کیا معنی؟ یہی کہ زبان سے "نہیں" کہہ دینا - پھر دیکھئے کہ عیب بھی ہے تو کس مزے کا کہ سیکڑوں عیوب سے نجات مل جاتی ہے - قوم کے وہ ناسمجھ جن کی فضول خرچیوں پر ایک زمانہ رو رہا ہے اگر یہ "نہیں" کا سہل سا لٹکا سیکھ لیں تو نہ اُن پر وہ مصیبت آئے جس نے ہزاروں گھرانے تباہ کر دیئے اور لاکھوں خاندان خاک میں ملا دیئے اور نہ ہمدردان قوم کو اس طرح نا اُمید ہو ہو کے رونا پڑے جس طرح بالفعل روز رو دیا کرتے ہیں اور کوئی مشکل نہیں - آپ ہی بتایئے کہ اب اس سے زیادہ آسان ترکیب کون ہوگی؟

حیرت تو یہ ہے کہ یہی "نہیں" ہم سے زیادہ اُن لوگوں کے کام آتی ہے جن کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہیں، جنھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور قوم پر کیسی تباہی آ گئی ہے - اپنے ذوق کے موافق وہ اس لفظ سے بڑا کام نکال لے جاتے ہیں اور سچ تو یوں ہے کہ اگر ہم ان کی سوسائٹی میں جائیں تو یہ لفظ ہمیں کھل جائے اور گھبرا کے ہم یہ دعا کرنے لگیں کہ خدا کرے ہمیں یہ لفظ بھول ہی جائے۔ معاذ اللہ - یہ ایک مختصر سا لفظ ہے کہ ساری لیاقتیں اور تمام زبان آوریاں، ریفارمروں کے خیالات، عقلا کی تدبیریں، واعظوں کی نصیحتیں سب اس کے سامنے مٹ کر رہ جاتی ہیں - اخبار ملاحظہ فرمایئے - "نہیں"۔ بد تہذیبوں کو چھوڑیئے - "نہیں"۔ ان خیالات سے باز آیئے - "نہیں"۔ بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ

بازی، کبوتر بازی یہ سب رذیلوں کی باتیں ہیں۔ شریفوں کو ان سے تعلق نہ رکھنا چاہئے۔ "نہیں"۔ پڑھنا لکھنا شریف کے لئے ضروری ہے۔ "نہیں"۔ روپیہ مفت نہ لٹانا چاہئے۔ "نہیں"۔ یہ خدا کی امانت ہے۔ "نہیں"۔ ایک دن مرنا ہے۔ "نہیں"۔ خدا کو منہ دکھانا ہے۔ "نہیں"۔ کچھ دین کی بھی فکر چاہئے۔ "نہیں"۔ ہر بات سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ "نہیں"۔ معاذ اللہ! آخر ضد کی بھی کوئی حد ہے؟ جناب ضد بری ہوتی ہے۔ "نہیں"۔ معقول۔ سنا آپ نے؟ دیکھئے یہی لفظ کس قدر ان لوگوں کے کام آتا ہے۔ یہ سب "نہیں" کی پہلی ہی صورتیں ہیں۔ غور تو اس بات پر کرنا ہے کہ یہ لفظ کس آسانی سے بلاؤں کو ٹال دیتا ہے۔ عقلمند کی "دور بلا" ایک مشہور مقولہ ہے۔ مگر انصاف کیجئے کہ "نہیں ایک ایسا لفظ ہے جو عقلمند اور بے وقوف، سمجھ دار اور ناسمجھ ہر ایک کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔ عقلمند جس بات کو نامناسب سمجھتا ہے، اُس کی نسبت سوچ سمجھ کے "نہیں" کہہ دیتا ہے۔ بے وقوف جس امر میں ایک ادنیٰ ظاہری مخالفت پاتا ہے، فوراً بے غور کئے "نہیں" کہہ دیتا ہے۔ سمجھ دار اسی لفظ کو لوگوں سے مشورہ کے لئے کہتا ہے اور ایک ناسمجھ بچہ ضد پر آجاتا ہے تو نوجوان امرائے قوم کی طرح بری اور بھلی ہر بات پر "نہیں" کہنے لگتا ہے۔ غرض کوئی نہیں جو اس لفظ کو استعمال میں نہ لاتا ہو۔ جو بری رائے کسی مہیب دشمن کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ اگر ٹلتی ہے تو "نہیں" سے۔ حقیقت میں "نہیں" ایک بڑا مفید اور کار آمد منتر ہے۔

یہ تو پہلی جہت تھی، اب دوسری جہت لیجئے۔ وہ دنیا منت ہی ڈھا دینی

ہے "نہیں" کے پہلے اور دوسرے اثر میں فرق یہ ہے کہ پہلا اثر تو کہنے والے پر پڑتا ہے۔ بلا اُسی کے سر پہ نازل ہوتی ہے جسے یہ ظالم لفظ سننا پڑتا ہے۔ ہائے اس کی صورت نہیں دیکھئے تو دل کو اتنا بڑا صدمہ پہنچے کہ کبھی بھولے ہی نہیں۔ بھولنا کیسا، ہر وقت دل پر ایک بے قراری کا اثر باقی رہے۔ ایک آوارہ گرد حرماں نصیب دشتِ وحشت کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ گم گشتگی کے ہاتھوں اس قدر تنگ ہو رہا ہے کہ باوجود تھک جانے کے کسی جگہ دم نہیں لیتا۔ تلووں میں کانٹے پیوست ہو گئے ہیں اور جو قدم آگے رکھتا ہے اور زیادہ پیوست ہوتے جاتے ہیں۔ مگر اتنا بھی نہیں ٹھہرتا کہ انھیں نکال کر پھینک دے۔ زندگی سے عاجز آگیا ہے۔ امید گھڑی گھڑی پہلو میں گدگدا دیتی ہے اور جو پاؤں بالکل بیکار ہو گئے ہیں، انھیں وہ جلدی جلدی اُٹھا کے چلنے لگتا ہے۔ چلتے چلتے اسے بیابان میں دور سے کسی اور شخص کی صورت نظر آتی ہے۔ یہ اُسے دیکھ کے لپکا اور اُس نے جو اِس کی صورت دیکھی تو وہ بھی اس کی طرف جھپٹا۔ دونوں چونکہ مُردہ جوش سے کام لے کر چلے تھے، دو ہی چار قدم چلے ہوں گے کہ گر پڑے۔ اب پڑے پڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے ہیں اور دل میں افسوس کر رہے ہیں کہ ہائے آواز نہیں پہنچ سکتی۔ امید نے خدا جانے دونوں کے کانوں میں کیا کہہ دیا اور نہیں معلوم ہمت نے کیسی مدد کی کہ دونوں گھٹنے پکڑ پکڑ کے اور سسکیاں بھر بھر کے اُٹھے اور شوق کے ساتھ ایک دوسرے کے پاس جانے کی کوشش کرنے لگے۔ شوق نے بڑی مدد کی کہ دونوں میں تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا۔ مگر کہاں تک؟ پھر گر پڑے؟ جب

اپنی اپنی تھکن پر آہ کھینچنے سے فرصت ملی تو ایک نے پوچھا "آپ کو راستہ معلوم ہے؟" اس کے ساتھ ہی اُس نے بھی سوال کیا "کہیں اُدھر پانی تو نہیں مل سکتا؟ پیاس کے مارے میرا دم نکلا جاتا ہے" دونوں طرف سے ایک ساتھ آواز آئی "نہیں" اور اس آواز میں خدا جانے کیا تاثیر تھی کہ سنتے ہی دونوں کو غش آگیا۔ صاحبو! اِس "نہیں" نے ان دونوں پر چاہے جو اثر کیا ہو، مگر بتائیے آپ پر کیا اثر ہوا؟

ایک ہمدرد قوم نے دم بھر کر غور کرنے کے لئے دلِ بیتاب کو ٹھہرایا ہے۔ دل ہی دل میں کہہ رہا ہے کہ "افسوس! اب تو امیدوں میں روز بروز نا امیدی ہی ہوتی جاتی ہے، کیا کیا جائے؟ آخر تنزل کی بھی کوئی انتہا ہے؟ باغِ اسلام ویران ہو گیا۔ ہری ہری کونپلیں جو نکلی تھیں وہ بھی مُرجھا گئیں، آبیاری کی کچھ فکر نہیں کی جاتی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہائے دنیاوی وقعت اور عزت درکنار، اب تو یہ لوگ دین کو بھی روز بروز چھوڑتے جاتے ہیں، مسجدیں سنسان پڑی ہیں، کوئی خبر گیراں نہیں۔ قومی مسافر اور غریب الوطن مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا۔ اِتقا کا نام نہیں۔ زہد میں ریا ملا ہوا ہے، عبادت دکھانے کو کی جاتی ہے۔ فقیری جوگ ہو گئی۔ امراء کو کچھ فکر نہیں۔ علماء کو خیال نہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ مقتدایان دین باہم لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ عوام ان بھیڑوں کی طرح جن کا کوئی نگہبان نہ ہو، اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اس سب پر مصیبت یہ کہ افلاس کو اُس جگہ سے اُنس سا ہو گیا ہے جہاں مسلمانوں کی

آبادی ہو" یہ سوچتے سوچتے وہ آبدیدہ ہو گیا۔ پھر آپ ہی خیال کیا کہ فلاں شخص اس وقت بڑا صاحبِ مقدور ہے، اگر وہ قومی خدمت پر آمادہ ہو جائے تو بہت کچھ کام نکل سکتا ہے۔ کسی نہ کسی قدر اصلاح ضرور ہو۔ ممکن ہے کہ اپنے سرمائے ہی سے کوئی کام کر لے اور وہ ایک مؤثر شخص بھی ہے۔ اگر اس کی زبان سے کسی کام کی تحریک کرائی جائے تو اور بہت سے امرا بھی متوجہ ہو جائیں گے۔ فقط یہی نہیں، عوام بھی اُس بات کو دل سے سُنیں گے جو اس کی زبان سے کہلائی جائے گی۔ یہ کہہ کے بشاش چہرے سے اٹھا اور ذی مقدور رئیسِ قوم کے پاس گیا۔ وہاں جا کے اپنی غرض نہایت پُر درد الفاظ میں بیان کی۔ جہاں تک زبان نے یاری دی، قومی ادبار کی تصویر کھینچ کے دکھا دی اور اُس رئیس کا دل نرم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جواب ملا "اجی میرے کئے سے کیا ہو گا؟" جو دوسرے الفاظ میں کہا جاتا تو "نہیں" ہوتا۔ یہ "نہیں" کا مترادف جواب سُن کے اس کے دل پر چوٹ لگی اور ایک بار کوشش کی کہ اپنی نا امیدی کو رفع کر لے۔ اسی غرض کو مکرّر ملتجیانہ انداز میں کہا۔ مگر پھر بھی وہی بلکہ اُس سے زیادہ سخت جواب ملا۔ روتا ہوا اٹھا کہ کسی عالم کے پاس جائے اور اپنی غرض اُن سے کہے۔ عالم صاحب فضیلت مآبی کی وجہ سے اپنے تئیں بخشا ہوا سمجھتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سنگدلی کا مادّہ ان میں زیادہ تھا۔ ان کے زعم میں کسی اور کی رائے پر عمل کرنا ان کے مرنے سے بہت ادنیٰ سی بات تھی۔ اس دردمند ہمدردِ قوم کے حسرت بھرے جملوں کو غور سے سنا بھی نہیں اور صاف کہہ دیا "نہیں مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" یہاں یہ شخص بالکل نا امید ہو گیا اور واپسی کے وقت دل میں کہتا جاتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہی پیشین گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ فتنوں کا ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ میں سب سے اچھا وہی شخص ہوگا جو دنیا کو چھوڑ دے اور شعب الجبال یعنی پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بھیڑ بکریوں کا ایک گلّہ لیکے بیٹھ رہے اور انھیں پر زندگی بسر کرے، گویا اس مقام پر سکونت پذیر ہو جہاں تک نہ فتنہ ہائے دنیا کا اثر پہنچتا ہو اور نہ دنیا کے لوگ پہنچ سکتے ہوں، نہ سوائے خدائے لایزال کے کسی کی حکومت ہو اور نہ کسی کی حفاظت ہو - بے شک اب وہی زمانہ ہے جب دنیا سے مایوسی ہوگئی اور قوم روز بروز اپنی طرف سے آپ ناامید کر جاتی ہے تو مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے - دیکھئے صرف "نہیں" کا لفظ تھا جس نے اس جاں نثار قوم کا دل دنیا سے کھٹا کر دیا - اب اس سے زیادہ کیا ناامیدی ہوگی کہ یہ شخص دنیا کے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوگیا -

---

ایک نامراد عاشق جس نے اپنی زندگی میں تمنائے یار کا بہت کچھ لطف اُٹھایا ہے اور جس کی عمر گویا وصال جاناں کی آرزو میں گزری ہے، خیالی امیدیں باندھتے باندھتے زندگی سے تنگ آگیا - اب روز بروز اس کے دل پر ناامیدی غالب آجاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے خیالات اور دھن میں کامیاب ہوگا - اُسے یقین ہوگیا کہ معشوق باوفا نہیں، بے وفا ہے - مگر اُمید نے یک بیک دل میں ایک جوش کے ساتھ ترقی کی اور ترقی کرتے کرتے اس حد کو پہنچی کہ سب نامرادیاں بھول گئیں اور یہ آرزومند امید کی رسّی میں بندھا کھنچتا ہوا درِ جاناں پر پہنچا - کوئے جاناں کی ہوا کھائی -

وہاں کے سین کو کچھ ایسا مانوس پایا کہ در و دیوار، زمین و آسمان، جو چیز سامنے آ گئی، اُسے محبت کی نظر سے دیکھا۔ جیسے اُس کے خیال میں یہ عزت حاصل تھی کہ کبھی کبھی معشوق کی پیاری آواز اس میں گونجتی ہے اور دل میں بڑی پُر جوش محبت کے ساتھ کہا کہ ہائے یہی فضا میرے لئے وہ آلۂ ٹیلیفون ہے جس کے ذریعہ میں اپنی ماہ وش معشوقہ کی باتیں سُن سکتا ہوں۔ اس خیال نے اور ترقی کی کہ ایک عجیب اُمیدوارانہ سکوت کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ شاید کسی طرف سے اُس مہ جبین کی آواز آ جائے۔ اتنے میں اوپر ایک کھڑکی کھُلی۔ جس کے کھلنے کی آواز نے اُس سراپا اُمید پر حسن کے نقیب کی آواز کا اثر کیا اور اُس نے نہایت ادب سے اوپر نگاہ اٹھائی۔ شوق کے ولولے کب رُکنے دیتے تھے۔ آنکھ لڑاتا تھا کہ اس بیتاب کی مدت کی ترسی ہوئی نگاہیں شوخیاں کرنے لگیں۔ نہایت ہی پُر شوق لہجے میں ہمارے دل دادہ یار نے کہا "آخر کبھی آرزو بھی پوری ہو گی؟" جواب ملا۔ "نہیں"۔ دل پر ایک چوٹ لگی مگر ضبط کر کے پوچھا "پھر کیا ہم پر کسی کو ترس نہ آئے گا؟" اب بھی وہی جواب سُنا گیا "نہیں" پھر صبر کیا اور کہا "ان تمناؤں کے بر آنے کی کوئی صورت بھی ہے؟" آواز آئی۔ "نہیں"۔ ابکی انتہا سے زیادہ ضبط کرنا پڑا۔ کیونکہ بیتاب عاشق نے کلیجے پر ہاتھ رکھ کے سوال کیا۔ "آخر ہمارے مرض کا کوئی علاج بھی ہے؟" ایک بے رُخی کے ساتھ پھر کہہ دیا گیا "نہیں"۔ مشتاق نے اس پچھلی "نہیں" کے ساتھ ہی کہا۔ "کیا تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کوئی مر جائے گا؟" مسکرا کر

جواب دیا۔ "نہیں۔" اُس ماہ وش کے مسکراتے وقت خدا جانے کس قیامت کی بجلی گری تھی کہ ادھر پیاری زبان سے "نہیں" نکلی اور ادھر یہ آرزومند دھم سے زمین پر گرا۔ دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ مگر عاشق کے دائمی سکوت نے خدا جانے کیا اثر کیا تھا کہ اُس ملائک فریب نازنین کو اپنے دل پر اختیار نہ رہا۔ یکایک نازک دل میں ایک ایسا جنون انگیز جوش پیدا ہوا کہ نہ پاس ناموس تھا اور نہ خیال رسوائی۔ اُدھر عاشق زمین پر گرا اور ادھر وہ نازک بدن کھڑکی سے کود دی۔ ناز و انداز ایک طرف رکھ دیئے گئے۔ غرورِ حُسن بالائے طاق رہا۔ عاشقِ جاں دادہ کی لاش سے لپٹ کر کہا۔ "نہیں، میں غلط کہتی تھی۔ مجھے تمھارے جان دے دینے کا یقین نہ تھا۔" لاش نے زبانِ حال سے کہا۔ "نہیں۔" بیتاب ہو کے کہا۔ "ہائے اب اُٹھ بیٹھو۔ پھر کبھی 'نہیں' نہ کہوں گی۔" سکوت کے لہجے میں جواب ملا۔ "نہیں۔" مایوس ہو کے پوچھا۔ "تو کیا اب نہ اُٹھو گے؟" پھر وہی جواب ملا۔ "نہیں۔" اس پچھلی "نہیں" نے اس حور وش نازنین پر بھی ایک دائمی خموشی طاری کر دی اور بڑی حسرت کے ساتھ اپنے شیدا کی لاش پر گر کر ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

حضرات! اب فرمایئے کہ اس "نہیں" نے کیسا اثر کیا؟ اور آپ کی کیا حالت ہے؟ دل میں ضبط کی تاب نہ رہی ہو گی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ میں جواب کی طاقت نہیں۔ علاوہ بریں ڈرتے ہیں کہ کہیں آپ بھی "نہیں" نہ کہہ دیں۔ ہمیں اس جواب سے بہت خوف معلوم ہوتا ہے۔ خدا

کے لئے اگر یہی کہنا ہو تو زبان روکے رکھے گا۔

ہائے! نہیں! تو بڑا سخت لفظ ہے! بس اب ہماری یہی دعا ہے کہ "بارا لٰہا چاہے جو کچھ ہو مگر ہم یہ ظالم لفظ نہ سُنیں!"

مضامین شرر

کسی نے کسی سے پوچھا "قیامت کس دن آئے گی؟" جواب دیا "قیامت صغریٰ تو اس دن ہو گی جس دن تم مرو گے اور قیامت کبریٰ اُس دن ہو گی جب ہم مریں گے!" بھلا اس میں کسی کو شک ہو سکتا ہے؛ نہیں، دنیا میں جو کچھ ہیں، ہم ہی تم ہیں بس اور کچھ نہیں۔ اس صفحۂ ہستی پر حکومت کرنے اور اس کی دلچسپیوں سے لُطف اُٹھانے کے لئے، ہم اگر بادشاہ ہیں تو تم وزیر ہو، ہم اگر آفتاب ہیں تو تم ماہتاب ہو اور تمہارا نام بھی صرف مروّت یا خاطر سے لے دیا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے سوا کوئی نہیں۔ تم ہو بھی تو فقط اس لئے کہ ہمارا دل بہلاؤ، ہماری خاطر داشت کرو، ہماری ہمدردی کو آمادہ ہو اور ہمارا ادب کرو اور اگر تم میں یہ وصف نہیں اور اپنی ان رعیتوں کے سے حقوق تم نہیں بجا لاتے تو تم بھی کچھ نہیں، بس ہم ہی ہم ہیں۔

صاحبو! ہمارے اس دعویٰ "اَنَا وَلَا غَیرِی" کو سُن کر ہنسو نہیں۔ ہمیں مجنوں نہ خیال کرو۔ غور کرو گے اور انصاف سے دیکھو گے تو خود ہی سمجھ

جاؤ گے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، سچ ہے اور ہمارے اس دعوے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سامنے تمھاری کوئی ہستی نہیں۔ آخر تم ہی کہو کہ یہ دنیا میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے، سوائے ہمارے کسی اور کے لئے ہے۔ فطرت کے جذبات ہمارے سینے میں جوشِ بے خودی پیدا کرنے اور نیچر کے لُطف ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ کے مسرور کر دینے کے لئے نہیں تو پھر کس لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

اگر صحراؤں نے اپنی سطح پر سبزے کا فرشِ زمرد یں بچھا کے اُسے جنگلی خود رَو پھولوں سے سجایا ہے تو اس لئے کہ ہم سیر کرنے کو آئیں گے۔ اگر باغوں میں مشاطۂ بہار نے عروسانِ چمن کو پھولوں کا زیور پہنایا ہے تو محض اس غرض سے کہ ہم دو گھڑی کو اُدھر ٹہلتے ہوئے نکل آئیں اور ان کیفیتوں کو دیکھ کے خوش ہوں۔ جا بجا وادیوں میں اگر نہریں لہراتی اور کسی معشوقۂ بادہ نوش کی طرح قدم قدم پہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی بہتی ہیں تو اس لئے کہ ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے مرکزِ تماشا کی جگہ پر اگر سر بفلک پہاڑوں نے برف کے سفید کپڑے پہن لئے ہیں تو اس سبب سے کہ یہ لباس ہمیں بہت ہی پُر لطف نظر آتا ہے۔ کسی دل ربا نازنین نے اگر بناؤ سنگار کیا ہے تو اس لئے کہ ہم اُسے بگاڑ دیں اور کسی کے حسن و جمال میں اگر خدا نے دل فریبی و دل ربائی کی شان پیدا کی ہے تو اس لئے کہ ہم اُس سے لطف اٹھائیں۔

ہم جہاں تک غور کرتے ہیں یہی نظر آتا ہے کہ عالم کی یہ ساری خوبیاں اور

اور دلچسپیاں صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ ہماری ذات سے ہیں۔ ہم نہ ہوں تو دنیا میں کچھ نہیں۔ عشق کی رونق ہم سے ہے اور بازارِ حُسن کی چہل پہل میں ہماری ہی بیتابیوں اور زندہ دلیوں کی گرمی ہے۔ یہ باتیں بھی خیر خیالات اور جذبات کی حد تک محدود ہیں۔ اگر واقعات اور موجودات کا مقابلہ کرو تو بھی ہم ہر ایک سے بڑھے ہی رہیں گے۔ ہماری ہی صورت اس قابل ہے کہ حسین سے حسین نازنین اس کی قدر کریں۔ ہماری ہی سیرت میں یہ کمالات ہیں کہ بڑا سے بڑا عالم دانا اگر ہمارا معتقد و معترف نہ ہو تو وہ عالِم نہیں، جاہل ہے۔ حُسن کا قدرداں اگر ہماری صورت زیبا کی قدر نہ کرے تو سمجھ لو کہ خدا نے اُسے ذوقِ صحیح نہیں دیا۔ وہ معشوقۂ ناز آفریں جسے اپنے حسن و جمال پر انتہا سے زیادہ ناز ہے، اگر ہمارے عشق اور ہماری محبت کی قدر نہ کرے تو جانو اس کا سر پھر گیا ہے۔

اور کیونکر نہ ہو؟ عالم میں جو کچھ ہے ہمارے ہی لئے ہے۔ خدا نے اپنی قدرت کی جو یہ مزہ دار نمائش گاہ مرتب کر رکھی ہے، اس سے لُطف اٹھانے والے فقط ایک اکیلے ہم ہی ہیں۔ آسمان کا یہ نیلگوں رنگ جس سے گلبدنانِ عالم اپنے دوپٹوں کے لئے ایک نظر فریب رنگ کا سبق لیا کرتے ہیں، ہمارا ہی دل بہلانے کے لئے ہے۔ آسمان پر یہ آفتاب و ماہتاب ہماری ہی صحبت و عیش کا چراغ روشن کرنے کے لئے ہیں اور یہ دلفریب تارے محض اس غرض سے ہیں کہ ان کی نورانی اجرام پر نظر جما جما کے ہم کسی دل ربا کی یاد تازہ کر لیا کریں۔ نسیم سحر کے جھونکے اس لئے آتے ہیں کہ

ہمیں فرحت بخشیں اور ابھی چند روز ہوئے جو لو کے جھونکے چل رہے تھے وہ بھی اس مقصد سے تھے کہ ہم میں ٹھنڈی اور زندگی بخش ہوا کی قدر کرنے کا مادّہ پیدا ہو۔ مینہ اس لیے برستا ہے کہ ہماری صحبتِ بادہ نوشی میں زندہ دلی پیدا ہو اور بجلی اسی غرض سے چمکتی ہے کہ ہم کسی کے گھبرا گھبرا کے سہم جانے کا تماشہ دیکھیں۔

ہم جو کہتے ہیں کہ عالم کی ساری دل چسپیاں اور خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے ہی لئے ہیں۔ اس میں شاید تمھیں شک ہوگا۔ ہماری یہ انا نیت اور خود پرستی کے دعوے سن سن کے تم ہنس رہے ہو۔ تمھاری صورت کہے دیتی ہے کہ ہمیں بیوقوف یا مجنون خیال کرتے ہو۔ اچھا تو ہم تمھیں ایک ثبوت بھی دیے دیتے ہیں۔ دیکھو جہاں تک ہم جوان تھے، دُنیاوی مسرّتوں سے لُطف اٹھانے کے قابل تھے، اُس وقت تک ان سب کیفیتوں میں دل چسپی بھی زیادہ تھی اور جب ہماری طبیعت بجھنے لگی، بڑھاپے نے ہمارے حوصلے پست کرنے شروع کر دیئے، اس وقت سے ان چیزوں میں وہ مزہ بھی نہ رہا جو پہلے تھا۔ پھر اگر یہ سب لُطف اور یہ تمام نعمتیں ہمارے لئے نہ تھیں تو ہماری طبیعت کے شکست ہوتے ہی بے مزہ کیوں ہو گئیں؟ اس زمانے کے میلوں اور اس دَور کی صحبتوں کو نوخیز اور نو عمر لڑکے چاہے کتنا ہی دل چسپ بتائیں مگر ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ان میں نہ وہ اگلی سی رونق ہے، نہ وہ پُرانی دل چسپیاں ہیں، نہ وہ چہل پہل ہے اور نہ وہ زندہ دلی

باقی ہے۔ ہماری عمر کے پُرانے زمانے والے جو باقی ہیں تم اُن سے چاہے جا کے دریافت کر لو کہ کسی زمانے میں یہ صحبتیں کیسی بامزہ اور پُر لطف تھیں اور جب سے ہم بوڑھے ہوئے کیسی سُست اور افسردہ ہو گئیں۔

ہمارے حالات اور ہمارا تخلیقِ عالم کی اصلی غرض سمجھ جانے کے بعد اس کون انکار کر سکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہیں ہم ہی ہم ہیں۔ تم دنیا کی ہر چیز کو غور و فکر سے دیکھو، صاف سمجھ جاؤ گے کہ جو چیز ہم سے جس قدر قریب ہے اور ہم سے جتنا علاقہ رکھتی ہے، اُسی قدر اچھی ہے اور اُسے جس قدر ہم سے بُعد ہوتا گیا ہے، اُسی قدر ادنیٰ اور بیکار ہے۔ یوں تو دنیا میں ہزارہا ملک پڑے ہیں جن کی خدا جانے کیسی کیسی تعریفیں سُنی ہیں، مگر تمھیں بتاؤ بھلا اس شہر میں، جس میں ہم رہتے ہیں، جس کو ہمارا وطن ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس میں بھی خاصۃً اس محلے سے جس میں ہمارا مکان ہے، کرۂ زمین پر اور بھی کوئی اچھی اور دل چسپ جگہ ہے؟ ہر جگہ اور ہر قوم میں طرح طرح کے آئین و قوانین جاری ہیں اور نئی رسموں پر عمل کیا جاتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اُن قوانین و رسوم کو دیکھیں اور ان کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے کا موقع پائیں تم سے کہے دیتے ہیں کہ نہ وہ قوانین ہمارے قوانین سے اچھے ہیں اور نہ وہ رسمیں ہماری رسموں سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ دنیا میں ایک سے ایک بڑا اور زبردست مذہب پڑا ہوا ہے اور جس میں دیکھو خدا شناس یا بانیِ مذہب الٰہیات کے رموز بتا رہے ہیں مگر ہمارے مذہب کے سامنے کسی کی کوئی وقعت نہیں۔ بس ایک ہمارا مذہب سچا ہے اور سب جھوٹے۔ اب تم اسے چاہے جنون کہو یا کفر،

ہمیں تو نظر آتا ہے کہ خدا بھی وہی اچھا ہے جو ہمارا خدا ہے اور خالق بھی وہی بڑھا چڑھا ہے جو ہمارا خالق ہے۔

خداوند جل وعلا چونکہ بے چون وچگون اور مجرّد محض ہے اور اس کی کُنہ ذات کو کوئی مادی شخص سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ہر مذہب کو عبادت کے لئے کسی سمت یا شخص کے ڈھونڈھنے کی ضرورت پڑی۔ ہر بانیٔ مذہب نے اسی سمت عبادت کے انتخاب میں ایک خاص قسم کا کمال دکھایا ہے۔ ہندوؤں نے قوی ہیکل اور بڑے بڑے یا معمول سے زیادہ ہاتھ پاؤں والے دیوتاؤں کو مرکز و مرجع عبادت قرار دیا۔ یونانیوں نے خوب صورت اور صاحب جمال عورتوں کی صورت کو مظہر قدرت مانا۔ آتش پرستوں نے آذرونار کو عبادت الٰہی کا واسطہ قرار دیا۔ یہود ہیکل سلیمانی کو اپنے عقائد خدا پرستی کا مرجع و ماویٰ خیال کرتے تھے۔ مسیحیوں نے اپنے خیالات کو صلیب اور مسیح مصلوب کی تصویر سے وابستہ کیا۔ مسلمان جو شرک کے کانٹوں سے اپنا دامن بچا رہے تھے وہ بھی آخر مجبور ہوئے اور کعبے کے سامنے سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ یہ سب انتخابات ہوئے۔ مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کسی نے اپنی عبادت کے لئے ہمیں سمتِ عبادت کیوں نہ قرار دیا؟ اور اپنا سر ہمارے سامنے کیوں نہ جھکایا؟ آخر ہم سے بڑھ کے مظہر قدرت اور کون ہے؟

خیر اگر کوئی نہیں تو ہم خود اپنی عبادت کیوں نہ کریں؟ یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہمارا دل خدا کا عرش ہے اور خارجی تعریفیں بھی تم سن چکے پھر ہم سے زیادہ خدا کی قدرت کا مکمل نمونہ کون ہو سکتا ہے؟ اور یہ جو ہم پرستش نہیں

کر رہے ہیں، یہ بھی ظاہر ہیں اور دکھانے کے لئے ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو جس قدر عزیز رکھتے ہیں، اپنی جس قدر قدر کرتے ہیں اور جس عنوان سے اپنے مقابلے میں کسی کی ہستی نہیں سمجھتے، یہ پرستش ہی کے درجے کو پہنچا ہوا ہے۔

پھر ان ہی حالات کو دیکھ کے اور اپنے ان کمالات پر نظر ڈال کے اگر صوفیوں نے جوش و خروش کے ساتھ "اَنا الحق" کا نعرہ بلند کر دیا تو کیا بُرا کیا یا بایزید بسطامی کی زبان سے کلمۂ "لیس فی جبّتی سوی اللّٰہ" نکل گیا تو کیا بُری بات ہو گی؟

مضامین شرر

آ کچہری

یہ آ ل بھی کچہری سے دامن بچائے کھڑا ہے ۔ اس کو بھی کچہری سے ڈر ہے یا چھوت لگ جانے کا اندیشہ ہے ۔ کیونکہ آ ل عربی نژاد ہے ، ہندی کچہری سے احتیاط اس کا قومی فرض ہے ، مگر کیا کرے ۔ اشارہ کرنے کو جس طرح انگریزی میں "دی" کی ضرورت پڑتی ہے ، مسلمان آ ل کو حرف اشارہ سمجھ کر کام میں لاتے ہیں ۔

آ ل کہتا ہے وہ کچہری ہے ۔ اس اشارہ میں بڑی بلاغت ہے ، بڑی ظرافت ہے ۔ کیونکہ کچہری کو ہم لوگوں نے جھوٹ بولنے کا ٹھکانا بنا رکھا ہے ۔ بڑے بڑے ثقہ لوگ جن کی ساری عمر سچ بولنے میں صرف ہوتی ہے ، کچہری میں جاکر جھوٹی گواہی دے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچہری میں سچ کیونکر بولیں ۔ یہ آ ل اس کا اشارہ کرتا ہے یعنی وہی کچہری جس میں جبّہ و عمامہ کو جھوٹ جائز ہے ۔

جغرافیہ ہر کچہری کا سارے ملک میں ایک ہے ۔ کچہری ایک جزیرہ ہے ، جس کے آس پاس عقل و تدبیر کے پہاڑ ہیں اور پھر قانون کے سمندر ۔

کچہری کا دلدادہ مسٹر ایل - ایل - بی کی گلی میں سو سو پھیرے کرنے میں ایک لذت پاتا ہے - اس کی جان میں جان آجاتی ہے جب وکیل یا بیرسٹر صاحب کی زبان سے مقدمہ کی سرسبزی کا کوئی جملہ سُن لیتا ہے - کچہری کا بیمار مرتے وقت صرف ایک ہی آرزو کر سکتا ہے کہ اُسے کسی قانون پیشہ آدمی کا چہرہ دکھا دو یا کم سے کم اُس کے گھر کا سائن بورڈ (نام کا تختہ) ہی منگا دو۔

کچہری کے مبتلا کو جب موت آتی ہے اور اس کے آس پاس کلمہ پڑھا جاتا ہے تو اس کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے —

کوئی صفدر بیگ حاضر ہے !!!

اور وہ فوراً حاضر حاضر کہتا ہے اور گھبرا جاتا ہے - لوگ سمجھتے ہیں فرشتے اس کے سامنے آئے ہیں اور خدا کی حضوری کا پیام لائے ہیں - کیسا نیک اور جنتی ہے کہ منہ سے حاضر حاضر نکلتا ہے -

کچہری کا دیوانہ اخبارات میں کسی خبر اور مضمون کو نہیں پڑھتا، اس کی نظر مقدمات کے اشتہاروں پر ہوتی ہے اور جب کسی اخبار میں اپنے مطلب کی خبر نہیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ اخبار بالکل نکما ہے اور کام کی بات تو اس میں ایک بھی نہیں -

کچہری کے شوقین جواریوں، شرابیوں اور تماش بینوں سے زیادہ اپنے شوق کے پکے ہیں - وہ مقدمہ بازی کسی حق کی خاطر نہیں کرتے - ان کو تو جوئے اور شراب کی طرح کچہری کی ایک لت ہوتی ہے جس میں ان کی دولت و زندگانی خرچ ہوا کرتی ہے - کچہری اور مقدمہ بازی جس کی زندگی ہے، وہ دنیا میں سب سے

کچہری میں قانون انصاف کے تخم بوتا ہے مگر اہلِ مقدمہ اپنی چالاکیوں کا کھاری پانی دے کر اس بیج کو ہرا نہیں ہونے دیتے۔ اسلامی حکومت کے زمانہ میں بھی کچہری کا یہی حال تھا اور مجھ جیسے دیوانے لوگ قاضیوں کے چٹکیاں لیا کرتے تھے۔

"کچہری کے جراثیم"

ڈاکٹر نے ہر جسم میں کیڑے دریافت کئے ہیں۔ وہ ہر مرض کا سبب جراثیم یعنی کیڑوں کو بتاتے ہیں اور کچہری بھی ہستی ہے، ایک وجود ہے، ایک جسم ہے۔ اس کے بھی جراثیم ہیں اور وہ وکیل، بیرسٹر اور مختار ہیں۔ کچہری کا مرض ان کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے۔

جس نے کچہری کی شکل نہ دیکھی ہو وہ کسی وکیل یا بیرسٹر سے ملاقات پیدا کرے۔ ایک دفعہ کا ملنا اس کو کچہری کا شائق بنا دے گا۔ کیونکہ اس میں کچہری کے کیڑے گھس جائیں گے۔

ان کیڑوں کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ یہ کیڑے ملک کے اچھے بھلے آدمیوں کو بیمار کر دیتے ہیں۔ کچہری کا مریض اور عشق کا بیمار ایک ہی حالت رکھتا ہے۔ عاشقی کا مرض بھی آدمی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور کچہری کی بیماری بھی انسان کا کام تمام کر دیتی ہے۔ کچہری کا چاہنے والا رسیلی اور حسین آنکھ سے بیزار ہوتا ہے۔ اُس کو کسی معشوقہ کے قدِ زیبا اور سخنِ شیریں کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ دفعات قانون کے ہندسوں پر مرتا ہے۔ تعزیرات ہند کی کتاب اس کے لئے نامۂ محبوب ہے۔ اسی کو سینہ سے لگاتا ہے، اسی کو چوم چوم کر جی ٹھنڈا کرتا ہے۔

زیادہ خطرناک ہے اور سب سے زیادہ قابل رحم۔ کتاب مقدس تعزیرات ہند اور اس کے تمام دفعات مبارکہ کی قسم کچہری بازوں نے حکام کچہری کو بدنام کر رکھا ہے۔ کچہری کے عشاق اپنے توڑ جوڑ سے قانون کو سیدھا راستہ نہیں چلنے دیتے۔

ضرورت ہے ڈاکٹروں کی جو کچہری کو محکمۂ حفظانِ صحت کے اُصول کے ماتحت لاکر کچہری پرستوں کے ٹیکہ لگوائیں اور وبائے کچہری سے اُن کی تندرستی کو بچائیں۔

نیز شہروں کی میونسپل کمیٹیاں جس طرح اور اور طریقے اختیار کر کے آبادی کی صحت کو امداد دیتی ہیں، اسی طرح مختاروں، وکیلوں، بیرسٹروں کو بھی قواعدِ صفائی میں شریک کر کے ان کو شہر سے الگ آباد کریں تاکہ یہ جراثیم عام باشندوں کو کچہری کے مرض میں مبتلا نہ کر سکیں۔ جس سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔

چٹکیاں اور گدگدیاں

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ! جب اس کی لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصرولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا، اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چانز لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ کی ایک جلد میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر! تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ! بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں، لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کرسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں، سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سُن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے، بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا۔ آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لئے جاتی تھیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبہ کی اذان پکاری جارہی تھی۔ دل نے کہا۔ جمعے تو ہزاروں آئیں گے، خدا سلامتی دے، نماز پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازہ کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک

خیر تو مرثیئے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہونا چاہیئے ؎

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

چٹکیاں اور گدگدیاں

———

ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریئے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن، نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی نہ بلبل کی مانند پھولوں کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادتِ رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے لئے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ میری مٹی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔ چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا اور ولبیٹ مسٹرایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں ہیں، افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

پٹنا

کہتے ہیں کہ "دیوانہ را ہوئے بس است"۔ اب اس مضمون کی حد تک دیوانہ آپ مجھے فرض کر لیجئے اور "ہو" اس تحریک کو سمجھ لیجئے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے "پٹنے" کے متعلق کی ہے۔ ان کی یہ تحریک پڑھ کر مجھے جوش ہی تو آ گیا کہ اپنے کسی "پٹنے" کے واقعہ کو لکھ ڈالوں ..... مگر میری بدقسمتی دیکھئے کہ مہینوں تک سوچنے کے بعد بھی کوئی واقعہ یاد نہیں آتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مضمون نگاری کے لئے "پٹنے" کی مشق کرنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ یقین مانئے کہ اگر مجھے پہلے سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دو چار واقعات اپنے اوپر ضرور نازل کر لیتا۔ فی زمانا بھی میں نے بہت کوشش کی کہ خیر جب نہیں پٹے تو اب پٹ جاؤ، مضمون تو لکھ لوگے۔ مگر کیا کیا جائے کہ باوجود ایسی کاروائیاں کرنے کے، جو ایک بھلے آدمی کے پٹ جانے کے لئے بالکل کافی ہو سکتی ہیں، میری یہ مراد کسی طرح بر نہ آئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ مرزا عظیم بیگ صاحب یا کسی اور مزاح نویس صاحب کو دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لائیں تاکہ ان سے بالی میں ایک ایک دو دو چونچیں ہو جائیں۔ اس کے بعد یقین ہے کہ اگر میرا مضمون پورا بھی نہ ہوا

تو انشاء اللہ ان کا مضمون ضرور کمپلیٹ ہو جائے گا۔ اس لئے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اے مردمان بکوشید تا جامۂ زنان نہ پوشید۔

ہاں ایک شرط ہے اور وہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے۔ یعنی یہ کہ جو صاحب اس مضمون کی تلاش میں بہ خرچۂ خود یہاں آئیں وہ اپنے نجیب الطرفین ہونے کا باضابطہ رجسٹری شدہ سارٹیفکیٹ لے کر آئیں کیونکہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ سے پٹنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس سارٹیفکیٹ کے ساتھ ہی کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دیا ہوا "اجازت نامہ خودکشی" بھی شریک رہنا چاہئے۔ کیونکہ ایک مرزاجی کے ہاتھ کی مار کسی مارواڑی کی توند تو ہے نہیں کہ آواز تو آئے "دھن" سے اور چوٹ لگے کسی سڑے ہوئے تربوز کی۔

بہرحال جو کوئی آئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئے اور ایسی شکل میں آئے کہ مرد اور عورت کی بہ آسانی تمیز ہو سکے تاکہ پٹ جانے کی صورت میں یہ نالہ و فریاد بلند نہ ہو کہ "دور ہوئے تو مرد ذات ہو کر 'بیربانی' پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

— عربی کی ایک مثل مشہور ہے کہ کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگو! کسی کام کو اختیار کرنے سے پہلے اس کی اصلیت کو معلوم کر لو۔ اس لئے قبل اس کے کہ میرا "چیلنج" یا "جسارت" قبول کیا جائے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ "پٹنے" کی ترتیب اس کی تعریف اور اس کی تاریخ سے ہر کہ ومہ کو آگاہ کر دوں تاکہ جس طرح ارکان مذہب کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ان کی ادائی میں مزہ آتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس پر "پٹنے کا عمل" ہونے والا ہے

بروقت وقوع واقعہ، اس سے پوری طرح لذّت اندوز ہو سکے۔

پس جاننا چاہیئے کہ علم مجبوریات میں یہ ایک ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور قواعد اُردو مولفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی رو سے یہ فعل متعدی مجہول یعنی یہ کہ اس فعل کا عمل ہمیشہ بے وقوفوں پر ہوتا ہے اور یہ صرف اسی قوم اور ملک کے لغات میں پایا جاتا ہے جو کسی زبردست خان کے زیر اثر ہوتا ہے یا ہوتی ہے یا ہوتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ ہم خدا کے فضل سے فارسی اور عربی بھی جانتے ہیں لیکن جہانتک ہم کو معلوم ہے فارسی زبان میں ایسے معنی دینے والا کوئی مصدر نہیں ہے۔ وہاں اس کے بجائے لفظ "کشتہ شدن" استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جن ملکوں میں زبان فارسی رائج ہے وہاں ایسا کوئی بے غیرت نہیں ہوتا کہ سر بازار یا زیادہ سے زیادہ دیوار کی آڑ میں پٹے اور پھر رسالوں میں اپنے پٹنے کی جوانمردی کا غلغلہ بلند کرے۔ وہاں جب پٹنے کی صورت پیش آتی ہے تو دو میں سے ایک "کشتہ شدن" ہو جاتا ہے۔ اب رہی عربی تو بھلا اس زبان میں یہ منحوس لفظ کیوں آنے لگا۔

بہادر عربوں نے اپنے ہاں ذرا پہلو بدل کر ایک مصدر "ضرب زید عمروا" ایجاد کیا ہے جس کے معنی ہیں کہ "کرے گا کوئی اور پٹے گا وہی"۔ یہ ایک ایسا وسیع المعنی مصدر ہے کہ ہر فاتح قوم نے اس کو اپنی زبان میں لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ہر فاتح قوم کی معمولی سے معمولی غلطی کا خمیازہ مفتوح "نو چہ" کو اٹھانا پڑتا ہے۔

مثلاً میم صاحبہ سے پٹ کر اگر کوئی صاحب اپنا غصہ بذریعہ ولایتی جوتے

کے عبداً کسی تلی کے "بین الصلب والترائب" پر اتاریں اور اس طرح وہ نالائق اپنی تلی پھٹ جانے دے۔ تو ایسی صورت میں اس ولایتی جوتے کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ سارا قصور اُس تلی کا ہے جو ایک ٹھوکر کی بھی تاب نہ لا سکی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مذہب ملک کی عدالت "ضرب زید عمرواً" کے حاصل مصدر کو پیش نظر رکھ کر یقیناً "ولایتی جوتے اور ملزم" دونوں کو بری کرے گی۔ یہ تو ہوئی پٹنے کی ترکیب۔ اب اس کے بعد اس کی تعریف کو لیجئے۔

فلسفہ میں "پٹنا" اس مسئلہ کو کہتے ہیں جس کا صغریٰ جوتی اور کبریٰ لکڑی ہو اور جس کا نتیجہ چاند کی صفائی نکلے، خواہ وہ چکنائی کی صورت میں یا بھنڈارہ پھوٹ جانے کی شکل میں۔ سائنس میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ایک جسم کے جوارح کی گردش سے ہوا کا جو تموج پیدا ہو کر دوسرے جسم پر ختم ہو اور اس دوسرے جسم کی رنگت کو مائل بہ سرخی کر دے "پٹنا" کہلائے گا۔ طب میں "پٹنے" سے مراد جسم کا وہ اُبھار ہے جو مومیائی کھائے اور ہلدی چونا ملے بغیر دفع نہ ہو سکے۔ معاشرت خانگی میں یہ لفظ بوجہ کثرتِ استعمال تعریف سے مستثنیٰ ہو گیا ہے اور ارتقائے تہذیب کے لحاظ سے گو اس کی صورتیں بدل جاتی ہیں مگر معنی میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی پانسو پانے والے انگریز نما ہندوستانی کی جنٹلمین بیوی بازار سے ایک ہزار کا سامان ایک دم خرید لائیں تو گو نھر ڈ کلاس لوگ اس کو "چاند ہونا" کہیں گے لیکن مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ اس واقعہ کا اظہار "پٹ" جانے سے کیا جائے گا۔ بہر حال ہماری روزمرّہ کی زندگی میں یہ لفظ ایسا عام ہو گیا ہے کہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل، موٹا ہو یا دُبلا، لمبا ہو یا ٹھنگا،

کالا ہو یا گورا اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شریفوں میں اس "پٹنے" کے اثرات میاں پر اور رذیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور زمانۂ موجودہ کی تہذیب میں انھیں مائل بہ سرخی اثرات کو دیکھ کر انسان کی شرافت اور رذالت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق لغت کے لئے لازمی ہے کہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی غور کیا جائے کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی ہے۔ لفظ "پٹنا" میں "نا" تو مصدر کی علامت ہے۔ اب رہ گیا "پِٹ" تو اس کے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ "حرف صوت" ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کسی بیوی کی پھُکنی یا دست پناہ میاں کی کمر پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ متمدن انسانوں میں یہ آواز اکثر گھروں سے آیا کرتی تھی۔ اس لئے دوسروں کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی غرض سے اس آواز کو مصدر کی شکل بنانا پڑا تاکہ لفظ "پِٹا" کے کہتے ہی سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں گھر میں پھُکنی اور کسی جسم انسانی کا اتصال ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ نے عمومیت کی شکل اختیار کی اور ایسی "کارروائیوں کے متعلق جو دو ہستیوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں رونما ہوتی ہیں اُس کا استعمال ہونے لگا۔

اگر اس لفظ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کچھ پٹنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ بچپن میں رونے پر پِٹتا ہے۔ لڑکپن میں نہ پڑھنے پر پِٹتا ہے۔ جوانی میں شادی کر کے پِٹتا ہے۔ بڑھاپے میں دادا نانا بن کر پِٹتا ہے اور کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی اس پٹنے کا سلسلہ

مختلف وجوہ اور نئی نئی شکلوں میں جاری رہنے والا ہے۔ جہاں تک منقولی شہادت مل سکتی ہے، اس سے ثابت ہے کہ پٹنے کی ابتدا ایک بڑے فرشتہ سے ہوئی ہے۔ یعنی سب شاگردوں نے مل کر اپنے استاد کو ٹھونک دیا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ استاد جو شاگردوں کو پیٹتے ہیں تو وہ درحقیقت اسی گستاخی کا بدلہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کو مار بیٹھے تو اس کا یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا افعال انسانی سے بڑھ کر فرشتوں کا فعل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے میں بھی ایک فرشتہ بن چکا ہوں۔

جب مڈل میں پڑھتا تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ترقی پاکر دوسری جگہ چلے گئے اور ان کی جگہ ایک دوسرے "حضرت" تشریف لائے۔ نام تو ان کا برکت رام تھا۔ لیکن مدرسہ میں بلحاظ اپنی چُھٹّی داڑھی کے "بکرت اللہ" کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ننھی سی داڑھی سے طالبعلم کیوں ڈرنے لگے۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوا اور کلاس مکتب بن گئی۔ برابر ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کا کمرہ تھا۔ وہ تھے صاحب بہادر اور بہت کڑوے مزاج کے آدمی۔ دو ایک روز تو ذرا چپ رہے۔ مگر جب اس "ہو حق" کا سلسلہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی گیا تو ایک دن صاحب نے بکرت اللہ صاحب کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ یہ غصّے میں بھرے کلاس میں آئے۔ جاتے وقت ایک سوال دے گئے تھے۔ ہم نے حل کر لیا تھا۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ہم نے بنچ سے اٹھ خوشی خوشی جا سلیٹ ان کے سامنے کر دی۔ یہ جلے

ہوئے تو تھے ہی، آؤ دیکھا نہ تاؤ زور سے ایک "لپٹر" رسید کیا۔ ہم روز اوّل سے استادوں کو مارنا سیکھے ہوئے تھے۔ ادھر انھوں نے ہم کو لپڑایا اور ادھر مسٹر "برکت اللہ" کے پیٹ میں اس زور کا مُکّا پڑا کہ بیچارے پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ کچھ نہ پوچھو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ دریافت ہوئی، شہادتیں لی گئیں اور جو فیصلہ آسمان پر ہوا وہی زمین پر ہوا۔ یعنی فرشتے اپنی جگہ پر رہے اور ان کے استاد نکالے گئے۔ خیر یہ تو ایک واقعہ معترضہ تھا، اب اصلی بحث کو لیجئے۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میاں بیوی میں اس "پٹنے پٹانے" کا آغاز کب سے ہوا۔ نسل انسانی کے ابتدائی جوڑے کے خانگی تعلقات کے متعلق کوئی صحیح روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعے پیش آتے ہیں کہ شریف سے شریف انسانوں میں بھی اس پر خانہ جنگی ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ سب سے بڑا جھگڑے کا جو پڑا تو وہی جنت والا معاملہ تھا۔ آپ خود ہی غور کیجئے کہ کسی میاں کے رزق کا دروازہ اگر محض بیوی کی غلطی سے بند ہو جائے تو ان حضرت کو کیا کچھ تاؤ نہ آئے گا اور فطرت انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اس تاؤ کا نتیجہ کیا کچھ نہ نکلے گا۔ جھگڑے کے دوسرے مواقع ان کے ہاں اولاد پیدا ہونے کے بعد سے پیش آتے لازمی تھے اور ضرور پیش ہوئے ہوں گے۔ کیا ہمارا مشاہدہ نہیں ہے کہ جب گھر میں دو بچے ہوتے ہیں، وہاں جس بچے کو میاں چاہتے ہیں، اس کو بیوی نہیں چاہتی اور جس کو بیوی چاہتی ہے،

اس کو میاں نہیں چاہئے اور یہی اختلاف "جاہلیت" اکثر خطرناک صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر بھلا جس گھر میں دن کو ایک اور رات کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہوگا وہاں اراکین خاندان مشترکہ میں کیا کچھ "اختلاف" نہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس مادہ میں کوئی یقینی شہادت نہیں ہے، اس لئے اس پر عقل آرائی کرنی اور قیاس سے کام لینا اصول روایت کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خانہ جنگی کا تخم ہماری فطرت میں ابتدا ہی سے بو یا گیا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ گھر میں اگر اس قسم کی دانتا کِلکِل نہ ہوئی تو وہ گھر "کا ہے" کو ہوا قبر ہو گیا۔

اس کے بعد سے "پٹنے" کے متعلق تاریخی شہادت برابر ملتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں پہلا تاریخی واقعہ ہابیل اور قابیل کا جھگڑا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کیا ہوا؟ جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟ اور عموماً جھگڑے کی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی اور اگر معلوم ہوتی بھی ہے تو وہ اکثر غلط ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مصدر عالم وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد کے واقعات اگر معلوم کرنے ہوں اور اس مصدر کے مشتقات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ عالم مولفہ مولوی فطرت اور مسٹر ضرورت۔

اس قدر سُننے اور سمجھنے کے بعد ہے کوئی باہمت جو میرے سامنے

میدان میں آئے اور نعرہ لگائے کہ ؎

منم رستمِ وقتِ افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

(خاص سرپنچ کی برسی کے لئے لکھا گیا)

مُردہ بدست زندہ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جیتے جی کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دُنیا داری ہی دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا، گویا اپنا عزیز مرگیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا، مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرگیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے، میرے ساتھ آیئے، آج کل کی میتّوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں، غریب بھی ہیں، امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں، کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔

جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواری میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پہ کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے ــــ "کیا مر گئے"؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے"۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے، تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔

یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے کچھ اُدھر۔ آگے آگے جنازہ ہے، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی، جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصّوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اُٹھانے کی اُجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ اخیر وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار

ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر
سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔
اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹر کی برائیاں، اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو
طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان
کر گئے۔ اس سے پیچھا چھٹا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی
وہی دنیا بھر کے "قصے" شروع کئے۔ غرض اسی طرح "جوڑی بدلتے بدلتے" مسجد
تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ
نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو، کپڑے
بدل، خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ جو اپنی وضعداری پر
قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا
اور پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار،
کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر
یا پان کھا کر انھوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم
ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ اِدھر نماز ختم ہوئی اُدھر یہ لوگ مسجد کے
دروازے کی طرف بڑھے۔ اِدھر جنازہ نکلا، اُدھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا
ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سنئے۔ اگر
میّت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔
اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں

بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے، مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر جیات و ممات ان ہی کے ذمہ تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔

موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں، جنازہ ہے کہ بڑھا تر چھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے، اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے، خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقّے صاحب، ان کی بیوی، دس بارہ بچّے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹّو، سو دو سو

مرغیاں، پانچ چھ بلّیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصّے میں قبریں ہیں وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں۔ نیم، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے، کسی کا تعویذ ہی غائب ہے، کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصّہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو، پہلے حصّے کا مُردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبر کی مرمّت کرتے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ نو روپئے کھڑے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصّے کا صاف رکھا جانا اصولِ تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں نہ صاف رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمھارے مُردے جانیں۔ میاں سقّہ لیٹتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اِدھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچّے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے، صبح باسی پھول لے جا کر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا، مُردے بھی خوش ہو گئے۔ اِس گھر میں بس بٹّا کبھی خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ قبر کے اچّھے

اچھے پتھر پر مسالہ پیس لیا - اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا - بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھر رہی ہیں، مرغیاں کچی قبروں کو کُریدر رہی ہیں، بچے یا تو چبوترے پر لوٹ رہے یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں، بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں - کسی بچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اس پر سقنی نے گیہوں سکھانے کو ڈال دیئے ہیں - ٹٹوانی کو ایک اگلی اور پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے، وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے - اس کے اِدھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری، کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا - اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کا نگڑے کا ہو گیا تھا -

جنازہ قبرستان میں کیا گیا، فوج میں ترم بج گیا - سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے لائی باندھ کر آ بیٹھا - کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی - کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج - سچ ہے، خدا رازق ہے - قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے -

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی، اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے - جنازہ لا کر لبِ گور رکھ دیا گیا - ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے - دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے - ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے -

کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے، کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے اور کوئی قبرستان والے کو بُرا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقہ سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلفہ پر سلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔ بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت سے، چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے داد سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا، کچھ اُن کا سُنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی دیا۔ جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا

اجلاس - دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے - دفتروں کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے - افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق اور تردید کی جا رہی ہے - سفارشیں ہو رہی ہیں، وعدے لئے جا رہے ہیں - غرض سب کچھ ہو رہا ہے - نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں - خیر خدا خدا کرکے خبر آئی کہ قبر تیار ہے - کچھ تو قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے - کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے - ایک صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا - ایک نے میّت کے اوپر کی چادر سمیٹی - چادر میں بل دیئے - دو صاحبوں نے میٹھے کے سرے پکڑ کر میّت کو اٹھایا - آٹھ دس نے غل مچایا " سنبھال کے سنبھال کے - میّت بھاری ہے - کمر کے نیچے چادر دو - ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو - ہاں آہستہ سے آہستہ " اب میّت قبر کے منہ تک آگئی - فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے، انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا - کوئی کہتا ہے " ذرا کمر کی چادر کھینچو - ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے - دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے - ہاں ہاں، ذرا اور جھکا کر - لا الٰہ الا اللہ - میّت بھاری ہے ذرا سنبھال کے، آہستہ آہستہ، بس بھئی بس " کوئی چیخ رہا ہے " میٹھے کے بندھن کھول دو - ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو - سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو - واہ بھئی واہ، اتنا بھی نہیں آتا - ابھی منہ پورا نہیں پھرا - بس بھئی بس "

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے - ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے - جو بچارے قبر میں اُترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا

کریں کیا نہ کریں۔

بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب اِس مرنیوالے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے "یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو"۔ کوئی کہتا ہے "لاحول ولا قوۃ مفت سو روپے مارلے اور کڑیاں دیں تو ایسی"۔ غرض کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے اور منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھنا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ مِنھا بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزّہ کون ہیں اور ان کی حالت کیا ہے۔ ہاں ان بچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے جُھکا کر لائے تھے مگر یہاں آ کر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ "فاصلہ بہت تھا"۔ کبھی کہتے ہیں "آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں آپ کے یہاں سے دوگنا مل رہا تھا"۔ بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اے اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کر۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

مضامین فرحت

قانونِ زندگی

انسانوں کی گرفت، باز پُرس، پُرسش، رسوائی، ڈر، خوف، ہراس، وحشت، گھبراہٹ، اضطراب، بے چینی، خطرہ، اندیشہ، دھمکی، سزائے ڈانٹ ڈپٹ، تخویف، مار پیٹ، قید، بندش، نگرانی اور تعطل کے کاغذی ذریعہ کو اگر "قانون" کہا جائے یا کہتے ہیں یا کہا ہے یا کہنا چاہیئے یا کہا گیا ہے یا کہیں گے یا کہا جائے گا یا کہو تو پھر شہ، نوٹس، سمن، وارنٹ، گالی گلوچ، دھول دھپّا، گھونسہ، بید، لاٹھی، ہوائی فیر، گرفتاری، ہتھکڑی، بیڑی، جامہ تلاشی، حوالات، زنبیلی روٹی، پھیکا ساگ، بغیر روشنی کا کمرہ مع مچھر، بچھو، سانپ، چالان، پیشی پر پیشی، اثبات دعویٰ، جواب دعویٰ، وکالتاً یا اصالتاً، پیروی، جواب دہی، تحریک، بیان، جواب دینے سے انکار، ضمانت، فرد جرم، عینی گواہ، صرفہ خوراک، اقرار صالح، جرح، تنقیحات، فیصلہ، ایک درجن بید، جرمانہ، بصورت عدم ادائے جرمانہ، قید محض، قید با مشقت، کال کوٹھری، بحالت بیڑی، کھدر کی قمیص، بحالت قیام جیل، تختی نمبر تلاں در گلو، چکی چلانا اس حالت میں کہ قیدی کا تخلص حسرت موہانی ہو، حبس دوام بہ عبور دریائے

شورہ اس شرط پر کہ مجرم علاقہ بنگال کا فرد ہو۔ قصاص، پھانسی اور سولی جب تک کہ مر نہ جائے۔ یہ سب لوازم قانون یا اثرات قانون کہلائیں گے یا کہے جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم سے کوئی "قانون" کی تعریف دریافت کرے تو ہم بریلی کے میلاد خواں لوگوں کی طرح بجائے کسی لغت اور بلاغت کے قانون کو اس علی مثال سے سمجھا دیں گے کہ گھوڑے کی وہ لگام جس کے ذریعہ گھوڑے یا گھوڑے پر بیٹھنے والے کو راستہ پر ایسا سیدھا چلایا جائے جو خطرے اور تصادم سے محفوظ رہے اور گھوڑے کی دوڑ یا چال یا رفتار کسی کے لئے مفید نہ ہو تو مضر بھی نہ ہو۔ اب اگر یہ کہیں کہ قانون ان افلاطونی اصول کے مجموعے کو کہتے ہیں، جن کے ذریعہ کبھی کبھی مجرم بھی بلا اخذ جواب رہا ہو کر مدعی کے حق میں اُلٹا ازالۂ حیثیت عرفی بن جاتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ پھر افلاطون بھی ذرا لے ذ نوف تھا کیونکہ قانون کی صحیح تعریف تو یہ ہو سکتی ہے کہ ــــ

"ایسا طریقہ جس سے انسان آزاد رہ کر بھی نقصان نہ پہنچا سکے اور نہ نقصان پائے"

اب اس تعریف پر اگر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف لفظ "ہرگاہ" کا۔ کیونکہ اصطلاحاً ہر وہ فقرہ اور ہر وہ عبارت قانون سمجھی جائے گی یا قانون کا اثر پیدا کر کے چھوڑے گی جس کے سرے پر یا شروع میں لفظ "ہرگاہ" ہو اور بقیہ عبارت اس قدر پیچیدہ اور گنجان ہو کہ اچھے بڑے مولوی صاحب بھی اس کا

مفہوم نہ سمجھ سکیں۔

وکیلوں کے خیال میں "قانون" وہ ہے جس سے مؤکل یا مؤکلہ تا لیع ہو یا بغیر پیشی نصف محنتانہ ادا کر دے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے یا ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا رکھتی ہو یا بصورت جیت جانے مقدمہ کے دس۱۰ روپیہ علاوہ محنتانہ کے "مٹھائی" کے نام سے ان کے بچوں کے ہاتھ پر رکھ دے یا ان کے منشی کو دیدے۔

ان تعریفات کے بعد ہمارے نزدیک "قانون" کہتے ہیں اس قوت کو جو انسان کے اندر دوسرے قویٰ کی طرح موجود ہے اور جو اس کی جملہ قوتوں پر احتساب و نگرانی کرتی ہے۔ یہ قوت انسانی کو غلط کاری اور غلط روی پیدا کرکے ہر مضرت محفوظ رکھتی ہے۔ اس قوت کی بقاء منحصر ہے انسان کی اچھی صحت اور بہترین ماحول پر۔ اگر انسان کی صحت نہایت درجہ معتدل اور صحیح ہو لیکن وہ جرائم پیشہ طبقہ میں رہے یا رکھا جائے تو اس کی قانونی قوت بیکار یا مضمحل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسے ماحول میں رہتا ہے یا رہتی ہے جہاں سب یا اکثر لوگ "قانونی زندگی" کے خوگر ہیں تو وہ ہر قسم کی غلط کاری اور غلط روی سے محفوظ رہ کر صحیح معنی کا انسان بن سکتا ہے۔ قانونی زندگی والے کی پہچان یہ ہے کہ سوسائٹی یا قوم کی متفقہ یا مروجہ طرز زندگی سے ایک بالشت، ایک انچ، ایک ہاتھ، ایک گز، ایک سوت یا کیلو میٹر بھی پیچھے نہ رہے اور نہ آگے بڑھے اور اسی لئے یہ واضعین قانون انسانی نے جو اصول و ضوابط انسانی زندگی کو منظم اور محفوظ رکھنے کے لئے وضع کئے ہیں وہ سراسر انسان کو وحشت اور

درندگی سے پاک کر کے پُرامن اور سلیقہ مند، منتظم اور نفع بخش بنانے والے ہیں۔ یہاں آپ واضعین قانون سے کہیں منٹرو، جے۔ پٹیل اور سر ملک عمر حیات خاں ٹوانہ کو نہ سمجھ لیجئے بلکہ وہ مافوق الفطرت انسان مراد ہیں جنھوں نے انسان کے پُرامن رہنے سہنے کے طریقے وضع کئے ہیں۔

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ قوت آج ہمارے ملک کے افراد میں کہاں تک باقی ہے اور جو نہیں ہے تو کیوں؟ مگر اس کے پہلے ان افراد انسانی کی قانونی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ہوگی جو صحیح معنوں میں یا بڑی حد تک قانونی زندگی کے دائرے میں آتے ہیں اس لئے لامحالہ ہم کو یہی سامنے والے لوگ عُرف انگریزوں کی زندگی کو مثال بنانا پڑے گا۔ مثلاً آپ ایک انگریز کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ صبح اذان کے وقت نیند سے بیدار ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ پھر وہ صبح کی میونسپل کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر غسل کرے گا یا منہ ہاتھ دھوئے گا یا کُلی کرے گا یا ناک میں پانی نہ ڈالے گا تو سر کے بالوں کو سنوارے گا یا مسواک نہ کرے گا تو برش سے دانت صاف کرے گا اور صاف کر کے رہے گا ورنہ جائے سے تو کسی حال میں نہ چوکے گا۔ پھر وہ اخبار پڑھے گا یا خطوط لکھے گا۔ پھر وہ اسکول جائے گا یا دفتر یا دکان یا کھیت پر یا پریڈ پر یا روٹی کے کارخانے میں یا اسٹیشن پر یا جہاز پر یا کسی کارخانے میں کام سیکھے گا ــــ بہر حال وہ کہیں جا کر رہے گا۔ پھر وہ عین دوپہر سے ذرا ہٹ کر کھانا کھائے گا۔ چاہے اس وقت اس کے سامنے کسی ہندوستانی کی پھانسی کا مقدمہ ہی کیوں نہ

پیش ہو۔ پھر وہ گھر آئے گا اور یہاں غسل کر کے پھر چائے یا بسکٹ یا سیب اور انگور کھائے گا۔ پھر وہ اصالتاً یا کتے کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا کرکٹ، ٹینس یا ٹھنڈی سڑک یا بازار کی تفریح کو جائے گا اور جاکر رہے گا تاکہ ہلکا سا پسینہ اس کے جسم سے پیدا ہو جائے۔ پھر وہ مغرب کی اذان کے بعد گھر آکر غسل کرے گا۔ پھر وہ ڈنر، ضیافت، ایٹ ہوم یا صرف اپنے ننھے میاں کی والدہ کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ پھر کچھ دیر اخبار، گپ، تاش، بلیرڈ، قہقہہ، شراب، غور و فکر میں گذار کر پلنگ پر خفتہ باشد ہو جائے گا یا ہو جائے گی اور دوسری صبح پھر وہ گذشتہ سے پیوستہ ہو جائے گا۔

یہ ہے انگریزوں کی وہ زندگی جسے قانونی زندگی کہا جاتا ہے یا کہنا چاہیے۔ بخلاف اس کے ہندوستانیوں کی زندگی میں قانون کی پابندی اس طرح نظر آتی ہے کہ وہ صبح سویرے نہ اٹھا ہے نہ اُٹھے گا یا کیوں اُٹھے؟ یا کیوں اٹھایا جائے؟ یا کون اٹھائے؟ اور کسے غرض؟ یا کون اٹھاتا ہے اور کس لیے اٹھائے؟ یا اٹھائے تو اس کی جھنجلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کون سنے؟ اور کسے پڑی ہے؟ پھر اگر وہ اٹھا بھی تو نصف گھنٹہ تک وہ کروٹیں ہی لیتا رہے گا یا لے کر رہے گا۔ پھر وہ پلنگ پر بیٹھ تو جائے گا مگر اس طرح کہ ابھی اس کی آنکھیں بند ہوں گی۔ پھر وہ اونگھنا شروع کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ وہ تکیہ پر سر رکھ ہی دے گا۔ پھر وہ اُٹھے گا اور اب وہ کبھی کان پر ہاتھ مارے گا، کبھی ناک پر مگر آنکھیں بند ہی رکھے گا۔ وہ اب پھر لیٹ جانے کی

طرف مائل ہوگا اور لیجئے وہ پھر لیٹ گیا۔ اب پھر وہ ہوشیار ہوگا لیکن اسی
گرانی کے ساتھ اور جو اب بھی اس کے پلنگ پر دھوپ نہیں آتی ہے تو وہ پھر
سو جائے گا اور سو کر رہے گا۔ اب دھوپ آجانے یا خمار ختم ہو جانے کی وجہ سے
وہ آنکھیں تو کھول دے گا مگر جنبش نہ کرے گا۔ صرف باآواز بلند جمائیاں لے گا
اور پانی سے بھرے لوٹے کو پلنگ ہی پر سے دیکھے گا۔ اگر تریب تر نظر آگیا تو وہ
اب حُقّے یا سگریٹ یا بیڑی کے کش لگائے گا اور پھر لوٹا لے کر میونسپل بورڈ
جائے گا اور وہاں سر کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ایک مرتبہ پھر سو جانے کی
کوشش کرے گا یا اونگھنے میں مصروف ہو جائے گا اور جو یہ کچھ نہیں تو صرف
آنکھیں ضرور بند کرلے گا اور بند کر کے رہے گا۔ اب وہ میونسپل بورڈ کے دوسرے
ممبر کی کھانسی یا ڈانٹ سن کر باہر آئے گا اور بقدر نصف مشک پانی سے
صرف ہاتھ منہ دھوئے گا۔ گویا تمام دنیا کا غبار اس کے چہرے کو خراب کر گیا
ہے۔ اس منہ دھلائی میں بقدر مقدرت خدام کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ واضح
ہو کہ ان کاموں میں دس بجے دن تک کا وقت گذر گیا۔ اب وہ گھر کے لوگوں
سے گپ شپ کرے گا۔ کمرے میں آکر تاش کھیلے گا یا کھانا کھا کر نوکری پر جائیگا
اور کوئی تین گھنٹہ کام کر کے پھر وہ لیٹ جانے کی فکر میں مصروف ہو جائے گا
اور، لیجئے وہ دوپہر کو کہیں لیٹ ہی گیا اور اگر دکان پر ہوگا تو چاہے گاہک
بغیر خریدے کے واپس چلا جائے گا مگر وہ لیٹ کر رہے گا۔ اس طرح وہ چار
بجے دن تک زندہ رہے گا اور اب وہ اس طرح گھر واپس آئے گا گویا چین و
جاپان کو وہ اکیلا ہی فتح کر کے ابھی ابھی واپس آیا ہے۔ اس وقت گھر میں اس پر

کام کرنے کی گرانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے کپڑے تک خود نہ اتارے گا اور جو افلاس کی وجہ سے ملازم نہ ہوگا تو وہ خود اُتار لے گا مگر اس طرح کہ کپڑا بھی اپنی مقررہ جگہ پر نہ رکھے گا۔ وہ اب کام کرکے آیا ہے اس لئے اس کی ہر بات میں غصّہ ہوگا اور گھر والے آپس میں اشاروں میں کہہ دیں گے کہ نوکری پر سے آرہے ہیں، بات نہ کرو۔ اب وہ انگریزوں کی تقلید میں چائے نوش کرے گا اور پھر حقّہ لے کر مکان کے باہر بیٹھ جائے گا اور تمام دوستوں کو دن بھر دفتر کے واقعات سُنائے گا یا پھر وہ تفریح کو جائے گا۔ اب اگر باغ کی طرف نکل گیا یا ٹھنڈی سڑک پر تو گرانی کا یہ حال ہوگا کہ کوٹ یا شیروانی کے تمام بٹن کھول دے گا اور ٹوپی ہاتھ میں یا بغل میں رکھے گا۔ قدم اس طرح اٹھائے گا گویا وہ اس سے پہلے کسی ٹانگے کا ٹٹو تھا اور اب اس ٹانگے سے کھول کر ٹہلا یا جارہا ہے۔ واپسی بجائے ٹھیک مغرب کے ٹھیک عشا کے وقت ہوگی اور جو راستہ میں کسی بے تکلف دوست نے کھانا بھی کھلا دیا تو اب وہ شب کے بارہ تیرہ بجے ہی گھر واپس آئے گا۔

اس مربوط و مسلسل زندگی کے بعد اس کی متفرق قانونی زندگی یوں ہے کہ جس راستہ سے سپاہی جانے کو منع کرے گا وہ اسی راستہ سے گذرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر سواری میں روشنی لے کر جانے کا حکم ہوگا تو وہ بغیر روشنی کے سواری کو سپاہی کے سامنے سے گذر جانے کو بڑی زبردست فتح سمجھے گا۔ اگر دعوت یا نوکری کا وقت دس بجے ہوگا تو وہ ہمیشہ گیارہ بجے پہنچے گا۔ البتّہ ریلوے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہنچنے کی جگہ وہ ہمیشہ دو گھنٹے پہلے پہنچ جائیگا۔

اگر ریل کے کسی ڈبّے میں صرف دس آدمی کی نشست کا قانون ہے تو یہ اس میں بیس اور پچیس ہو کر بیٹھے گا۔ مسجدوں میں سیدھی صف بنا کر نماز پڑھنے کا قانون ہے تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی صف بنا کر نماز پڑھے گا۔ اگر اسے اِڈیٹر ہو کر کسی اخبار یا رسالہ کو پابندی سے شائع کرنا ہے تو یہ ہمیشہ ڈبل نمبر شائع کرے گا اور اعتذار میں صاف لکھ دے گا کہ اب دیر نہ ہوگی مگر پھر ہوگی۔ اگر وہ ریل کے ذریعہ کسی دوسرے شہر جائے گا تو ہمیشہ مقررہ دن سے ایک دن بعد پہنچے گا۔ جب اسٹیشن پر ایک بھی استقبال کو نہ آئے۔ اگر وہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے تو کرایہ ہمیشہ دوسرے مہینہ ادا کرے گا اور جو یہ ہندوستانی ہوا کہیں کا رئیسِ اعظم تب تو اس کی ساری زندگی میں قانون کا وجود ڈھونڈے نہ ملا ہے نہ ملے گا کیونکہ وہ تو ہے رئیس اور رئیس کے لئے ویسے بھی قانون کاغذ کا ایک پُرزہ ہے۔ کہ کہا ہے جرمن کے وزیرِ اعظم نے، خدا کرے اب ان لوگوں کو سوراج اور مل جائے پھر دیکھنا قانونی پابندیاں۔

نکات رموزی

غنودگی

انسان کے اندر "غنودگی" بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبّر، جلیل القدر سپہ سالار، باوقار علماء، صاحبِ عظمت وزراء اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، یعنی سب اونگھتے ہیں۔ غلط ہے کہ اس کی کیفیت کا نمایاں اثر افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ گانجا، چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں۔ بلکہ یہ جاں پرور کیفیت ان سب کی امداد کے بغیر پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو انسان دنیا و ما فیہا سے یک لخت......

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا، غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے کافی پایا۔ عمر، موسم اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پچاس برس کی عمر کے بعد لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکایک...... اگر انھیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا......

موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت
اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جانا محال ہو گیا
ہے اور بعض بزرگ تو دسترخوان ہی پر...... مگر قوائے جسمانی کے لحاظ
سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے ہیں۔ جب کہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ
اس کے برعکس پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان
تندرست آدمی کو سوار کر دیجئے اور چاہے جس موسم میں سوار کر دیجئے وہ
ایک اسٹیشن تک تو کھڑکی سے مناظر قدرت کی سیر میں مصروف رہے گا۔
مگر دوسرے اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلہ میں وہ
کم از کم ایک سو مرتبہ...... اگر اسٹیشن پر "گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی"
کی آواز سے وہ بیدار بھی ہو جائے تو گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ پھر......
غنودگی کا غلبہ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے لیکن یہ
بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے۔ جہاں غنودگی کے
پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد اور اسی لئے، اللہ بخشے، ہمارے
بڑے مولوی صاحب ریل میں اپنا صندوق اپنے کمر بند سے باندھ کر بیٹھتے تھے۔
دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے۔ جہاں آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ
صفحہ پڑھا کہ...... ! خصوصاً ایسے طلبہ پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے جو
انٹرنس کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگرچہ نوجوان طلبہ بھی
اس کے انسداد کی تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر سب بے سود۔ مثلاً ہمارے ایک مستعد
شاگرد نے غنودگی سے تنگ آ کر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جو اس

حدتک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گئے لیکن اس کے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی......! غصّہ میں آکر انھوں نے انگریزی کرسیاں پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ اب غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ بے شبہہ وہ دیر تک پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد انھوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جما دیں۔ پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دیئے اور مطمئن تھے کہ غنودگی اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ...... ہم نے جا کر دیکھا تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا اور خود...... بیدار کیا تو جھنجلا کر رہ گئے۔ منھ ہاتھ دھو کر آئے اور اس مرتبہ بہت زور زور سے چلّا چلّا کر پڑھنا شروع کیا مگر ابھی آواز میں کوئی دل پسند سُر بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ......

یہ تو تھے غنودگی کے نقصان رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو نماز باجماعت اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں امام صاحب کوئی طویل تر سورت پڑھتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ مسجد کی صف میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ توہین ہو کر رہے گی۔ مثلاً جہاں امام صاحب اَلحَمد شریف سے آگے بڑھے کہ آپ کو تمام جسم میں ایک لطیف سنسنی محسوس ہوگی۔ آپ ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے اور دوسرے پاؤں کو آرام دیں گے۔ لیکن سنسنی بڑھتی جائے گی اور آپ کی گردن خود بخود گریبان کی طرف جھک جائے گی۔ پھر کچھ دیر بعد آپ

نیت باندھے باندھے پاس والے نمازی پر دھڑا دھڑ.......... اب
اگر اس حالت میں امام نے رکوع کیا تو آپ کو رکوع کرنا محال سا معلوم
ہوگا۔ مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دیں گے مگر رکوع کے لئے خمیدہ
ہونا....... اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب امام صاحب ہاتھوں کو دوسرے
سجدہ میں جانے کے لئے جنبش تو کر دیں گے مگر درمیان ہی میں ....
پھر کچھ سر اٹھا کر پڑھنا چاہیں گے کہ......... یہاں تک کہ امام صاحب
سجدہ سے سر اٹھالیں گے تو آپ گھبرا کر یا تو سجدہ میں بغیر امام کے چلے
جائیں گے یا نادم ہو کر ایک سجدہ پر قناعت کر لیں گے۔ ہمیں تو نماز با جماعت
میں یہاں تک تجربہ ہے کہ امام صاحب نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا
اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہ۔ مگر یہاں قعدہ اخیر ہی میں بیٹھے رہے۔
جب پاس والے نمازی نے کہنی مار کر بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہوگئی۔
مگر فوراً سُبْحَانَ اللّٰہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہہ کر غنودگی کی خفت کو کم کیا،
جو ناکام رہی۔ اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب چلا کر کہتے تھے کہ جب ایسی ہی
نیند آتی ہے تو جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو؟ اور امراء نے شاید
اسی لئے نماز جماعت ترک کر دی ہے؟

وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہوئی اور لوگوں میں
گھر کر بیٹھ جائیے اور وعظ کہنے والے قسمت سے بریلی، بدایوں، مراد آباد یا
دیو بند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے بعد سے غنودگی کا سلسلہ
یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور

کبھی بند کرنا اختیار کرتے ہیں۔ اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے، جہاں محفل کی روشنی چہرہ تک نہیں آتی تو پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو جھکا دیتی ہے۔ پھر دونوں گھٹنے کھڑے کر لئے جاتے ہیں اور ان پر دونوں ہاتھ رکھ لئے جاتے ہیں اور اب جیسے ہی گردن جھکائی کہ.......... آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر.......... اس موقع پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سُن رہے ہیں، اونگھتے نہیں ہیں۔ حالانکہ لمحہ بہ لمحہ........ تا آنکہ وعظ ختم ہو گیا لیکن یہاں ہیں کہ.......... اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لئے کوئی دیوار ہاتھ آ گئی تو پھر تمام محفل والے اپنے اپنے گھر جا پہنچے۔ لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیئے....... آخرکار صاحب مکان آتا ہے اور کہتا ہے کہ اٹھئے صاحب یہ تبرک لیجئے۔ تب کہیں ایک بڑی سی جمائی لے کر لاحول ولا کہتے ہیں اور بادلِ ناخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے۔

ہم کوئی حیدر آباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہل قلم تو نہیں ہیں کہ فکرِ معاش سے بالکل الگ رہ کر دن کی بہترین روشنی میں انشاء پردازی فرماتے رہیں۔ بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں دفتر کے "منشی جی"۔ اِدھر شب کے ابتدائی حصہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ جب وہ سو جاتے ہیں اور وہ بھی سو جاتی ہیں تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں۔ کوئی ایک اوپر تیس اخباروں اور رسالوں کے لئے اس وقت مضامین تیار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس شب بیداری سے

خدا معاف کرے، صبح کی نماز........ مگر اس کو کیا کہیئے کہ دین دنیا کی وجہ نجات محترمہ والدہ صاحبہ اذانوں کے وقت سے اٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ادھر حمد وحہ کا رعب اور اثر اس قدر ہے کہ چوں نہیں کر سکتے"........ جہاں حمد وحہ نے آواز دی" بھیا" اور ہم فوراً" جی بہت اچھا" کہہ کر چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں مل کر دیکھا کہ اماں جی کدھر ہیں۔ اگر وہ اپنے کمرہ میں نماز کے لئے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے ہمیں آ لیا اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رُخ کیا اور درمیان ہی میں....... مگر اماں بھی خوب جانتی ہیں کہ ہم آدھ گھنٹے تک اونگھتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی آوازوں کا تار باندھ دیتی ہیں۔ جہاں ہمیں دیکھا کہ ہم....... کہ انھوں نے فوراً" ہوں ہوں"...... اور ہم فوراً تیزی سے ہوشیار تو ہو گئے مگر پھر...... اب چار پائی سے نیچے پاؤں لٹکا دیئے۔ آنکھیں بند اور....... کہ پھر انھوں نے پکارا" بھیا سورج نکلنے والا ہے" اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھ کر جھومنا شروع کیا کہ پھر" بھیا........" ہم فوراً سنبھل گئے۔ ایک دو مرتبہ منہ پر ہاتھ پھیرا، کبھی داڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر...... یہاں تک کہ اب نھنے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا رکھ دیا۔ تو ہم نے انھیں بہت غصہ سے دیکھا۔ مگر انھوں نے اماں جی کو سُنانے کے لئے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا" اٹھتے کیوں نہیں ہو؟ بیٹھے اونگھ رہے ہو؟" وہ تو یہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے میں بھاگ گئیں اور ہم جھنجھلا کر لوٹا ہاتھ میں لئے گھر کے میونسپل بورڈ کی طرف چلے۔ اب حسب دستور عام صبح چونکہ ہر گھر کے میونسپل بورڈ میں حاجت مندوں کی کثرت ہوا کرتی ہے، لہذا

اگر اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آ گئی تو ہم وہیں لوٹا ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے، اور لگے .... یہاں تک کہ خاصی صبح ہو گئی اور ہم .... غرض .... دعا ہے کہ خدا صبح کی غنودگی سے ہر شریف آدمی کو بچائے۔ اگر دہلی کے بڑے .... حکیم جی اس کا نسخہ تجویز فرمائیں تو ایک بوتل کے خریدار ہم بھی ....۔

نکات رموزی

ارہر کا کھیت!

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حاجئ اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں۔ لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی "ہیر، ہیر" اور "چیرز" جواب "رقص پروانہ" اور "برفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صداہائے بازگشت ہیں، جو شاید سب سے پہلے کسی آلہ بکر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹر لو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیش رو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں

کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک قضائے حاجت کرنا اور دوسرا نان کوآپریشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں گھر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے، کتّے بھونکنے لگتے ہیں، کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں، گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلہ میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دل آویز تھی اور دوسرے دن کی مشقت خوش آئند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے۔ کسان کی بیوی، اس کے بچّے، بچّیاں اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں، جتنا خود مویشی کے لئے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو، وہ آج کل کے روشن خیال میاں بیوی سے زیادہ خوش قسمت ہے، خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی۔

لیکن وہ دیکھے گا۔ گاؤں کے قریب والے کنوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے، جیسے کوئی کہن سال وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ، جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندان قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں پر شباب لیکن بے خطر کنوئیں کی جگت پر تھیں پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیوں کو دعوتِ تہدید و عتاب دیتی ہوئی، کچھ بوڑھیاں تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آپہنچا۔ نوجوان، جگت پر بیٹھنے والیوں، نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی اور طراری سے اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہولیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان، جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی۔ یہ ہم چلتے چلتے ایک تاریک نا قابلِ گذار اندیشہ ناک اور خار دار سدّ روئین کے سامنے رک گئے۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیّاحی میں
لیکن بعض ثقات جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ــــ اڈہر کا کھیت۔

ناظرین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم چورن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرام جاں اور مونس قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید داند کے مزید قول وقرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے ــــ اور کسی کا گدھا کھو گیا ہے وہ بھی بھٹکتا ہوا آپہنچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوب کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکوریڈ یا "جشنِ نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں، یہ گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے۔ مہا بھارت یا اڈہر کا کھیت۔ مہا بھارت تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کی سفارش اور اڈہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا، اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر
ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔
ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفا خانے میں ورنہ
جیل خانے میں۔ جیل خانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے
اور شفا خانہ کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی
گذرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ اس کے نوجوانوں
نے اسراف شباب کے لئے شفا خانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔ زندگی
کے آثار آپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیل خانہ کے ڈنڈے میں پائے
جاتے ہیں۔ شفا خانہ سے زندگی اور جیل خانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا
سالن یا بے تمباکو کا پان۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں۔ لیکن تندرستی کا
مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں
پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ
سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ شباب اور پیری دونوں
حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار "دشمنِ ایمان و آگہی" یا "رہزنِ
تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا........؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبۂ آزادی سے زیادہ دلچسپ
ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری
طرف سب کا انتظام بھی پورا کر لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں سے عقل کی شرمساری کی نوبت آتی ہے، تو گاؤں والے لبسولہ سے کام لیتے ہیں اور عدالت ڈنڈے سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سُنانا۔

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے اِلّا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک پالوریپ اور دولت حیّ و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے اِلّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزّت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے، جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنّن جس کے لئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے۔ آج چوپاٹی اور اپالو دریا برد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی اور اپالو تعمیر کرے گا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں تنظیم آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک

نحیف سی ہلکی رنگین تحریر۔

چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کے مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ چھپڑ انسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ادھر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا شور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے؟ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے؟ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیاں کے بچّہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا؟ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی پہلوٹھی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھوا ہوگا۔ اس پر اختلاف آراء ہوا اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے؟

اندھیرے میں گالی گلوج موثر نہیں ہوتی۔ دونوں آگے بڑھیں۔ ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ لعوق حفظانِ صحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا۔ دو بیک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ ہنیا کے لڑکے مکندا کا فعل تھا۔ دونوں نے مکندا کو بانگِ

ڈھیل کو سا۔ یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکند یا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی گے اوپر جا گرا۔ دونوں چیخ پڑیں۔ منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا۔ سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ "خشک طہارت" کا خیال رہا نہ ترکِ نجاست کا۔ ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بٹیر، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ.......
گویا اسمبلی میں بم گرا!!

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لئے، اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اُس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اُس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہی ہو جاتا ہے، جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اسی اثنا میں ایک کتّا سامنے سے گذرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ "نقض امن" ہوئے گویا اُردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتّوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گذرا اور ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیوں! اس طرف کا

دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی ؟
اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ میں ہامی بھری - ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا - بولا — میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے - دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا (خوانچہ کے اندر، جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا، کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے - یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے -

اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسیٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے - لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے حاجی بلغ العلیٰ کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے !

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے - کچھ لوگ "سابق دیوانۂ ہمدرد" اور حال "ابو المجنون" کہتے ہیں - کچھ دنوں "خشت البزابہ" پر زور لگاتے رہے - ان دنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں - اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے — ملتے ہی فرمانے لگے "جلدی سناؤ جلدی" - میں نے کہا کیا فرمایا ؟ کوئی اچھا سا شعر - میں نے کہا سنئے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے

یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر "بجلوہ ریزی" کمل و "پرفشانی ریش" اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔
میں نے کہا۔ کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں۔ فرمایا ۔۔ الہر کا کھیت۔
میں نے دریافت کیا۔ کیوں جناب! اس شعر کا یہ معاوضہ؟ سخن فہمی کی داد دوں؟ کمل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا کاتبین پر ڈال دیا۔ میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے نام و نشان، حسب و نسب، وطن و مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ (مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ غلط مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا کون؟ نواب مزمل اللہ خاں صاحب۔ کیا یہ شعر سنایئے گا؟ کہنے لگے۔ نہیں جی، وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر۔ میں نے کہا۔ ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنایئے گا ؎

ترا کہ زور بہ بازوئے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقیست

فرمایا۔ یہ کیا؟ میں نے کہا یہ ہے ؎

من آں علم و ہنر را با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر بے اختیار ہو کر فرمایا۔ ارے میاں

یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو؟ اچھا تمھارے کلاس میں بیٹھ جاؤں؟ ذرا تمھارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا ۔۔ اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا؟ فرمایا۔ السلامُ علیکم۔

اس کے پڑھنے سے بہنوں کا بھلا ہوگا :۔۔۔

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔

(۲) اگر عنوان بُرا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔

(۳) اگر کتابت کی غلطی ہو تو نیاز صاحب ذمہ دار۔

(۴) اگر کُل بُرا ہے تو ناظرین ذمہ دار۔

خط و کتابت و ترسیل زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

مضامین رشید

پاسبان

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کر دی تھی اور غالب کے پرستاروں نے ہماری - ایک صاحب فرماتے ہیں، غالب قومی شاعر تھے۔ دوسرے کہتے ہیں، حیوان ظریف تھے ۔ تیسرے کا قول ہے، ہم غیب تھے۔ چوتھے کا فلسفہ ہے، فلسفی تھے ۔ پانچواں کہتا ہے، حرف مہمل تھے ۔ ممتحن پوچھتا ہے، کیا تھے ؟ طلبا رجواب دیتے ہیں :-

شامتِ اعمال ما صورتِ غالب گرفت

لیکن خود غالب کی شامت پاسبان تھے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے

اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لئے

بایں ہمہ غالب شاعری کو نہیں "سپہ گری" کو ذریعہ عزت سمجھتے تھے۔ ممکن ہے کہ شاعری کے سال وتکمیل کے لئے پانچویں یا ساتویں پشت کی مدت کافی ہوتی ہو - کم سے کم انیس نے تو اسے ثابت کر دیا - لیکن سپہ گری کی تکمیل تو غالب سے سویں پشت تک نہ ہو سکی - ورنہ

دل ہی تو سیاستِ دربان سے ڈر گیا

کے کیا معنی ؟

لیکن اصل یہ ہے کہ ہم خود غالب نہ ہونے کے باوجود پاسبان کے سامنے آپ کو (یہاں مطلب ناظرین سے نہیں، واحد متکلم سے ہے) کچھ گداگر ہی سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ البتہ خیریت یہ رہی کہ پاسبان کے قدم لینے کی غلطی کبھی نہیں کی۔ آپ کسی شخص، چیز یا موقع کا تصور نہیں کر سکتے جو پاسبان سے خالی ہو۔

ایک بار یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا، دو چیزیں ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں کیسے موجود ہو سکتی ہیں ؟ میں نے کہا، کیوں نہیں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا، کیسے ؟ میں نے کہا۔ اور منطقی کسے کہتے ہیں ؟ ابھی ابھی منطقی نے میرے نظریہ کو ثابت نہیں کیا تھا کہ ایک بزرگ (یہاں بزرگ سے مردِ معقول نہیں بلکہ مردِ مسن مراد ہے) بول اٹھے۔ میاں چاہے کچھ کہو، ہندوستان کی نجات تو پاسبان سے ہے۔ منطقی نے کہا، بحث غیر متعلق ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی نجات کا سوال ! ایک خاں صاحب شطرنج کھیل رہے تھے۔ بولے، برخوردار ! پولیس سے سابقہ نہیں پڑا اور یہ کہتے ہوئے مہرے کو دبا کر آگے کھسکایا اور پھر بولے۔ برخوردار ! پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔

منطقی نے برافروختہ ہو کر کہا۔ جناب خاں صاحب ! آپ اخلاقی اور منطقی دونوں غلطیوں کے ساتھ مرتکب ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف حریف شاطر ایک لالہ جی تھے۔ انھوں نے اپنا مہرہ بڑھاتے ہوئے فرمایا، برخوردار !

پولیس سے سابقہ نہیں پڑا - اب خان صاحب کی باری تھی - انھوں نے بھی چال چلتے ہوئے یہی فقرہ دُہرایا - لالہ جی نے دوسری چال چلی اور اسی فقرہ سے جواب دیا - جیسی چال ہوتی، موقع پڑتا یا طور تیور سے چلتے، اسی انداز سے مہرے دبا کر، اُٹھا کر، بسرعت یا با احتیاط مہروں کو تکان بھی دی جاتی اور اسی لب و لہجہ، جرأت، حلم، مسکینی، طنز یا ظرافت کے ساتھ برخوردار والا فقرہ دُہرایا جاتا -
یہاں تک کہ دونوں کے پیادے رخ اور فرزی بننے کے لئے جلد جلد بڑھنے لگے - برخوردار والا فقرہ بھی جلد جلد دُہرایا جانے لگا - لالہ جی کا فرزی پہلے تھا - خان صاحب نے کہا، برخوردار! تم نے بے ایمانی کی - لالہ جی نے کہا، برخوردار! بے ایمان پر تین حرف - اب دونوں نے مزید خانگی رشتے جوڑنے شروع کئے - چنانچہ خان صاحب نے بساط اور لالہ جی نے ناریل سے 'برخوردار' کو بدل لیا - نتیجہ یہ ہوا کہ بساط منطقی کے سر پر، چلم منطقی کے آغوش میں اور پولیس کا سپاہی حاضرین وسط میں -

ایک دن بالا دست سے ملنے گیا - میں بڑے لوگوں سے ملنے میں ذرا اعتدال پسند واقع ہوا ہوں اور محض اس خیال سے کہ بڑے لوگوں کے خفیہ اور ان کے پاسبانوں کے اعلانیہ سلوک سے بہت ڈرتا ہوں - لیکن کیا کرتا تیوہار کا دن، کپڑے اچھے اور ستھرے، ایسا موقع کب ملتا تھا - چنانچہ احاطہ میں قدم رکھا ہی کہ ایک ڈبلو کالے کُتّے نے لپک کر خوش آمدید اس لہجہ میں کہا کہ میں قطعاً بھول گیا کہ نئے جوتے پہن کر بھاگنا خصوصاً ایسی حالت میں جب نئے

کپڑے پہننے کی توفیق اور بھاگنے کی مشق نہ ہو، نہایت غیر شاعرانہ اور غیر محفوظ حرکت ہے، وہ بھی جبکہ شروانی کا دامن حدِ شرعی پائجامہ کی مہری سے مائل باختلاط۔ انگریزی جوتے کا تلا نیا، سٹرک پُرانی اور کتا بے تکلفی پر آمادہ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فاصلہ اور سرعتِ رفتار میں عمودی حرکت افقی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بھاگنے والا ایک لحنت حکیم آئن سٹان بن جاتا ہے اور فطرت نے ہندوستانیوں کو جس نجیب الطرفین چرمی کھدر میں ملبوس کیا ہو وہ بقدر ستر دندان نما کہنی، گھٹنے اور ٹھوڑی سے غائب ہو جاتا ہے۔ بقولِ غالب بہ نسخہ دیگر

کہنیاں نگار اپنی، گھٹنا خوں چکاں اپنا

میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ واقعات مجھے پیش آئے۔ میں نے صرف امکان وقوع کا اشارہ کیا ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت یوں سمجھتا ہوں کہ بعض بد مذاق یا ستم ظریف یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ یا تو لکھنے والے پر گزرتا ہے یا پڑھنے اور سُننے والے پر صادق آتا ہے۔ یہ سب صحیح، لیکن واقعہ ہے کہ میں کُتّے سے یوں بھی کچھ ڈرتا ہوں اور یہ میرے اور کُتّے کے نجی معاملات ہیں جن سے ناظرین کو دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن اس میں ہم دونوں کی پوزیشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے میں ان کا تذکرہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں تو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میں کم سے کم جہاں تک کُتّوں کا تعلق ہے، کچھ بہت زیادہ دلیر بننا پسند نہیں کرتا اور دلیر بننا یا نہ بننا قطعاً ذوقی چیز ہے اور میرے نزدیک ہر ذوقی چیز قابلِ درگذر ہے، خواہ وہ عمر طبعی پر پہنچ کر شادی کرنا ہو یا لیڈری سے روٹی کمانا ہو۔ خیر تو میں کہتا تھا کہ کُتّے مجھے پسند نہیں ہیں۔

میں نے کالے کتے سے آخر میں صلح کرلی۔ یعنی کبھی تم کو تمھاری کوٹھی اور مجھے اپنا جھونپڑا مبارک۔ لیکن یہ کتے کی غلطی تھی کہ اُس نے دب کر صلح کرنے والے کی خلوص نیت کا یقین کر لیا۔

میں نے واپس آکر اپنے ایک عزیز دوست سے کہا۔ ایک صاحب تمہارا کتا خریدنا چاہتے ہیں، اپنے آدمی کو ساتھ کر دو کہ میں دکھلاؤں۔ انھوں نے اپنے پہلوان کتے اور مریض نوکر کو ساتھ کر دیا۔ میں ذرا اطمینان سے بجائے فرار پر واپس آیا۔ ہمارے دوست نے ہم کو دیکھا۔ یہ معلوم نہیں میرے مسکرانے پر وہ غرائے یا ان کے غرانے پر میں مسکرایا۔ ہمارے دوست کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس وقت ان کا مقابلہ پسر نوح اور اصحاب کہف دونوں سے تھا۔ انھوں نے جست کرکے معانقہ کرنا چاہا۔ لیکن بجائے اس کے کہ میرا گلا اور ان کا دندان مبارک ہوتا خود ان کا ٹیٹو ہمارے نو آمدہ مہمان کے منہ میں تھا جو میرے پیچھے گلزار نسیم بنے کھڑے تھے ؎

دانت اس کے تھے گورکن قضا کے

دو نیمچے رہِ عدم کے ناکے

نوکر پہلے بھاگ چکا تھا۔ میں نے دونوں دوستوں کو تخلیہ میں سرسید کا مضمون بحث و تکرار بہ آواز بلند اسٹیج کرتے چھوڑا اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔

ایک بار مجھے دور دراز کا سفر کرنا پڑا۔ خیال آیا روپئے کم ہیں اور سفر طویل، سبیل ایسی کرنی چاہیے کہ یا تو سفر مختصر ہو جائے یا روپئے فراہم ہو جائیں۔

مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اس کا پروگرام بناتا ہوں۔ چنانچہ جب تہائی سفر اور روپیہ ختم ہوگیا تو خیال آیا۔ یہاں پہنچ کر آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ کام شروع کرنے کے بعد پروگرام ہی کیوں بناؤں؟ میں کہتا ہوں یہ کمزوری ہے اور اپنی کمزوری تسلیم کرنے کے بعد آپ جتنی حماقتیں یا مظالم چاہیں، کر سکتے ہیں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ بڑے آدمی ہوں، ورنہ آپ جانتے ہیں موچی (بعض وہ لوگ جو موچی نہیں چمار کا لفظ استعمال کرتے ہیں) کو عرش پر بھی بیگار ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن آپ یہاں جائز طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ خود بڑے ہیں یا موچی۔ اس سوال کا جواب دینے سے مجھے انکار ہے اس لئے کہ ضابطہ فوجداری میں آیا ہے کہ کوئی شخص ایسا بیان دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کے جواب میں اس کے مجرم قرار دیئے جانے کا احتمال ہو۔ بڑا آدمی بننا لطف کی بات ضرور ہے لیکن اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ اکثر بڑھاپے میں شادی کرنا پڑتا ہے یا ایک طویل خاتمہ۔ اور کیا ہوا اگر میرے بڑا ہوتے ہوئے بڑے آدمیوں سے دونوں چیزوں کا بیک وقت مطالبہ کیا جانے لگے۔

میرے لئے یہ اکتفا کرنا ہے کہ میں کہہ دوں کہ جب میرے ذہن میں پروگرام آگیا تو اس پر ضرور عمل کیا جائے گا۔ خواہ کام جس سے وہ پروگرام متعلق ہو ختم ہی ہو چکا ہو۔ اس بارے میں مَیں شعرا کا مقلد ہوں۔ کوئی خیال آگیا تو وہ باندھا ضرور جائے گا۔ خواہ اس حرکت پر لوگوں کو اپنا کرایہ دے کر شاعر صاحب کو پیٹنے ہی کیوں نہ آنا پڑے۔ بہر حال راستے میں ایک مشہور درگاہ تھی۔ میں نے

کہا پہلے یہیں قسمت آزمائی جائے۔

اسباب سرائے میں رکھا اور میں درگاہ پہنچا۔ درگاہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی اور وہاں کے پاسبانوں کو دیکھ کر جان و مال کا اندیشہ ہوا۔ نہایت لمبی چوڑی، عالی شان عمارت، فربہ اندام فقیر، لحیم و شحیم مجاور۔ عمارت سے زیادہ فقیر گندے اور فقیروں سے زیادہ عمارت گندی۔ یہاں پہنچ کر خیال آیا کہ پروگرام تو بنایا نہیں۔ سوچا کہیں بیٹھ کر قوالی شروع کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ نہ اشعار یاد ہیں اور نہ گانا آتا ہے۔ تالی بجانے کی مشق کالج میں تھی لیکن وہاں کی اور یہاں کی تالی میں فرق ہے اور اس فرق کو لوگوں نے محسوس کر لیا تو یہاں کوئی ایسا تو ہے نہیں جو اس کا قائل ہو کہ تالیاں صرف دونوں ہاتھوں سے بج سکتی ہیں۔ ممکن ہے یہاں کی تالی کا پرچۂ ترکیب استعمال یہ ہو کہ ہاں ان کا اور کسی غریب الدیار کی طبلی۔ تھوڑی دیر تک دماغ پر زور دیتا رہا۔ معاً خیال آیا کہ گو اشعار، تالی اور قوالی کچھ نہیں آتی لیکن قوالی کی ایک گت آتی ہے۔ یعنی

"اہے وائے!"

چنانچہ اہے وائے کچھ سوچتا، کچھ گنگناتا داخلِ عمارت ہوا۔ پہلے پاسبان نے پکارا اور اس طور پر کہ ساری عمارت گونج گئی۔ "قدم درویشاں ردِّ بلا" اور نہایت تپاک سے فیس داخلہ طلب کی۔ میں نے کہا جناب پیسے ہوتے تو وطن کیوں چھوڑتا؟ یہاں اس نیت سے آیا ہوں کہ حضرت کے فیض سے کچھ پیسے مل جائیں گے۔ فرمایا خدا نہ کرے۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے ـــ میں بولے کہا آپ نے میرے بارے میں غلط رائے قائم کی ہے۔ میں صرف عیالدار

مفلس ہوں اور آپ چاہیں تو نتیجۃً مقروض اور مریض بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کہنے لگے یہ سب صحیح لیکن جب تک کچھ خیر خیرات نہ کیجئے گا حضرت کی خوشنودی کیوں کر حاصل کیجئے گا۔ کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ میں نے عرض کیا حضور والا یہ مزار شریف ہے یا امپیریل بنک؟ پاسبان نے اب کچھ اس طور پر گھورا کہ مارے خوف کے قلب سینہ میں اور چونّی جیب میں لرزنے لگی۔ میں نے چونّی دربان کے نذر کی اور "اہے واے" کہتا ہوا چار سور ماؤں کی معیت میں آگے بڑھا۔ ایک مقام پر طائفہ کھڑا ہوگیا۔ حکم ہوا کہ یہاں حضرت نے وضو کیا تھا' اکنّی رکھ دو۔ میں نے رکھ دی۔ اِکنّی کے ساتھ ایک بزرگ ڈھے گئے۔ دوسری منزل پر بتایا گیا کہ حضرت نے یہاں چلّہ کھینچا تھا' آٹھ آنہ پیش کرو۔ وہ بھی پیش کر دیئے گئے۔ ایک صاحب اور کم ہوئے۔

چلتے چلتے ایک اور مقام پر پہنچے۔ ارشاد ہوا بارہ آنہ رکھو۔ حضور نے یہاں دعا مانگی تھی۔ تم بھی مانگ لو۔ میں نے کہا۔ کچھ آپ بتا سکتے ہیں حضور نے کیا دعا مانگی تھی؟ کہنے لگے۔ یہی مانگی ہوگی کہ خدا مسلمانوں کو جملہ آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ میں نے کہا۔ اہے واے دعا کب مقبول ہوئی کہ میں بھی مانگوں۔ اس پر ہمارے دوست ورہبر یک لخت چراغ پا ہوگئے اور قریب تھا کہ مزار شریف مشہد مقدس بن جائے کہ میں نے ان کے ہاتھ پر مطلوبہ رقم رکھ دی جس کا کرشمہ یہ تھا کہ ان کا سارا ولولۂ جہاد مزاج شریف اور دعائے لطیف پر ختم ہوگیا۔ پھر پوچھنے لگے حضرت آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟ میں نے کہا جناب ٹمبکٹو سے آرہا ہوں۔ فرمایا وہاں مزارات ہیں؟ میں نے کہا جہاں کہیں مسلمان ہیں

مزارات ہیں۔ دریافت کیا۔ متولی اور سجادہ نشین کون ہیں؟ میں نے کہا فی الحال تو میں ہی ہوں اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے کے لئے ہندوستان آیا ہوں۔ پوچھا اوقاف کی آمدنی کیسی ہے؟ میں نے کہا کافی سے زیادہ۔ کہنے لگے۔ اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ یہاں کی حالت تو نہایت زار ہے۔ متولی صاحب پر ایک عورت اور ایک انگریز کا بڑا اثر ہے۔ مزار شریف کی ساری آمدنی انھیں پر صرف ہوتی ہے۔ ہم خدام تو اسی روکھی پھیکی پر بسر کرتے ہیں، جو آپ لوگوں سے مل جاتی ہے۔ میں نے کہا۔ بھئی انگریز اور عورت سے کسے اور کہاں مفر ہے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ اس قسم کی تھی کہ اس کا تذکرہ نامناسب ہے .... چنانچہ ہم اپنے دوست سے جدا ہوئے اور آخری بزرگ کی معیت میں آگے بڑھے۔

آخر میں ہم دونوں ایک کھڑکی کے قریب پہنچے۔ اچھا اب ایک روپیہ نذر کیجئے اور اس کھڑکی میں منہ ڈال کر دعا مانگئے، قبول ہوگی۔ میں نے کہا۔ جناب یہ ایک روپیہ نقد حاضر ہے، میں دعا سے باز آیا۔ کہنے لگے نہیں جناب یہ یہاں کا دستور ہے، آپ مزار شریف کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ بھائی توہین نہیں کرتا۔ اَہے وائے حواس مختل ہیں۔ کہیں اُلٹی سیدھی دعا مانگ گیا تو ہم یا تم خواہ مخواہ بندھے پھریں گے۔ کہنے لگے۔ ہرگز نہیں۔ اس آستانہ سے کوئی محروم نہیں پھرا۔ میں کھڑکی میں منہ ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ ہمارے رفیق نے سوچا کہ یہ شخص ٹال رہا ہے۔ فرمایا۔ دعا مانگو۔ میں نے کہا۔ مانگ تو رہا ہوں۔ کہنے لگے۔ ہم سے کیا پردہ، زور سے دعا مانگو۔ میں نے

کہا۔ آپ سے کیا تکلف۔ لیکن زور سے مانگوں تو ممکن ہے کہیں مکین مزار کی عافیت میں خلل ہو۔ فرمایا۔ اس کا خیال نہ کرو، ہم سنبھال لیں گے۔ میں نے دعا مانگی جس میں رقّت، نفرت اور خفگی سب کچھ شامل تھی۔

"اے برگزیدہ روح، دعا کیجئے اس گناہگار اور کم بخت ہستی کو آج سے پھر کسی مزار یا مجاور سے سابقہ نہ پڑے۔"

مجھے یہ نہیں معلوم نہیں کہ میں نے گردن باہر نکالی یا اس بارے میں مجھے اپنے رفیق کا احسان مند ہونا پڑا۔ لیکن اس کے بعد میں تنہا مزار شریف سے باہر آیا۔ بعض فقراء اور مساکین نے میرے ساتھ ہمدردی کرنا چاہی لیکن ہمارے آخری کرمفرمانے وہیں سے للکارا ــ خبردار! وہابی ہے وہابی!!

میں نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ سرائے میں پہنچا تو سامان غائب!

"آہے وائے!!" ایک صاحب نے بڑی دعاؤں اور التجاؤں کے بعد ایک رفیقۂ حیات کو پایا۔ عہد زفاف منانے کے لئے کسی مقام پر پہنچے۔ عروس کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ ارشاد ہوا، تم کیسے احمق ہو جو ایسی جگہ لائے۔ غریب نے دبی زبان سے کہا۔ جانِ من جگہ کا انتخاب تو تمھیں نے کیا تھا۔ خطاب ہوا۔ لیکن تم نے اختلاف کیوں نہیں کیا؟

کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی نصف مصیبتیں محض اس لئے ہیں کہ بابا آدم اپنی سالم پسلیوں کے ساتھ سپردِ خاک نہیں ہوئے اور غالباً جس بنا پر عربی میں اندھے کو بصیر کہتے ہیں اسی بنا پر انگریزی میں بیوی کو نصف بہتر

کہتے ہیں۔ مجھے اس نصف بہتر کی اضافتوی شانِ نزول نہیں معلوم ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے "نصف بہتر" نے ہم کو اس بات موقع ہی نہیں دیا کہ اس بارہ میں گور کندن اور استخوان بر آوردن (ریسرچ) پر عمل کر سکتا۔ ایک چیز البتہ ذہن میں آتی ہے۔ یعنی اگر شوہر اور بیوی مل کر ایک ہوئے تو نصف بہتر بیوی ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں اخلاقیات اور وظائف الاعضاء میں تصادم ہوتا ہے۔ اس بارہ میں میرا نظریہ پدریہ یہ ہے کہ نصف بہتر یا نصف بدتر کا اطلاق والد اور والدہ سے اتنا متعلق نہیں ہے، جتنا نورِ چشم اور نورِ چشمی سے!

لیکن یہاں اب تک جو کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے وہ کچھ غیر متعلق سا ہے۔ سوال پاسبان کا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں موضوع زیرِ بحث سے نہایت طویل طویل انحراف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ انکشاف صرف راقم السطور کا ہے۔ ناظرین میرے اعتراف سے سے قبل اس کا احساس خود بخود کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی انشاء پردازی اور سخن سرائی کا ایک گر ہے۔ اُستادوں نے ایک گُر تو یہ بتایا ہے کہ مخاطب کو احمق سمجھو اور پھر تم کو حماقت کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ دوسرا گُر یہ ہے کہ بکواس یا لکھواس (برعایت قافیہ) کیے جاؤ۔ البتہ موقع بہ موقع عنوان یا مبحث کو دُہرا دیا کرو، بیڑا پار ہے۔ لیکن میں مخاطب حضرات کو ایسا نہیں سمجھتا جیسا مجھ سے بہتر لوگوں نے ان کو سمجھا ہے۔ تاہم ان کے لیے اتنی رعایت گوارہ کر لوں گا یا کبھی کبھی ان کو بتا دیا کروں گا کہ

موضوع زیر بحث کیا ہے۔ تجسّس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا سدّ راہ نہ پردہ ہے اور نہ پیالز۔ چنانچہ ان حیثیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ عورت انگریزی ہو خواہ سوراجی، وہ پاسبان اور خفیہ پولیس دونوں ہے۔ جس طرح بات کرنے میں کبھی کوئی فقرہ ایسا نکل جاتا ہے، جس کا انجام عبرتناک اور مداوا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض فقرے کبھی قلم سے بھی ایسے نکل جاتے ہیں جن کی مکافات بھگتنا ہی پڑتی ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب معاملہ انگریز اور عورت دونوں سے اٹکا ہو تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز اور عورت دونوں ایسی چیزیں ہیں جن سے مرد معقول ڈرا کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ انگریز عورت ہو یا عورت انگریز۔ بہر حال اس وقت عورت کی انگریزیت یا جنسیت کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا۔ میں اس وقت اس کی سوراجی حیثیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس سوراج سے جو اسے اپنے گھروں میں حاصل ہے۔ ہندوستان کے سوراج اور ہندوستان کے گھریلو سوراج میں بہت بڑا فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ ہندوستان کے سوراج میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں۔ گھریلو سوراج میں مرد کی حیثیت بالکل پورن راج کی ہے۔ پورن راج کے بارے میں سُنا جاتا ہے کہ یہ وہ چیز ہوگی جس کے بارہ میں کہا ہے۔

کسے را با کسے کارے نباشد

چنانچہ گھریلو سوراج میں مرد کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ مرد کو تمّا چھوڑ دیا جائے تو دنیا کو نقصان کے بجائے فائدہ ہی پہنچے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ

اس کا از کار رفتہ ہونا بھی گوارہ نہیں کیا جاتا۔ آپ کہیں گے نکمّا اور از کار رفتہ ہونا ایک ہی چیز نہیں ہے لیکن یہاں سوال طِب یا لغت کا نہیں ہے سوال صرف ہندوستانی اکیڈمی کا ہے اور بس۔

عورت، جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، متجسّس اور پاسبان دونوں ہے۔ اس کو اس کا فکر نہیں کہ مرد روپیہ کس طور پر کماتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کیوں کرتا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل سوز خوانی نہیں، دِقّت تو اسی پر آتی ہے کہ اس کا خرچ کرنے کا تصور وہی ہے جو آئی۔سی۔ایس اور برطانوی اقتدار کا ہے۔ یعنی ہر فعل جو آئی۔سی۔ایس کرتا ہے، برطانوی اقتدار میں معیّن ہوتا ہے اور ہر وہ فعل جو کسی ہندوستانی تعلیم یافتہ سے سرزد ہوتا ہے، برطانوی اقتدار کے منافی ہے۔ وہ مرد کے مخلص ترین دوست کو اپنے سب سے نکمّے رشتہ دار سے بدتر سمجھتی ہے لہذا اپنے ہر فعل کے جواز میں کسی نہ کسی طور اس حقیقت کو جتا دیا کرے گی کہ تم سے شادی کرنے میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی کی ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ پیش کرے گی کہ فلاں بیوی کے پاس مُرغی، طوطے، بندر، بھالو پلے ہوئے ہیں اور تمھارے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اب اگر یہ کہئے کہ آپ کے اعزّہ اور سات پشت اس کام کو کرتے آئے ہیں، کیا ہرج اگر آپ کی دل چسپیوں کی جولان گاہ ان سے مختلف ہو تو پھر دیکھئے شوہر کو مسلم لیگ قسم کی صدارت کس کس طور پر تفویض ہوتی ہے۔

متجسّس اور پاسبان کبھی فارغ نہیں ہو سکتا۔ یہی حالت عورت کی ہے۔

اس کی ساری زندگی مسلسل تفتیش اور تذبذب ہے۔ دولت اور شہرت کو وہ پسند کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس سے اس کو آرام پہنچتا ہے، مادّی اور غیر مادی بلکہ یہ چیزیں اس کو اس لئے عزیز ہیں کہ ان سے وہ دوسری عورت کو شرمندہ کر سکتی ہے یا زیر رکھ سکتی ہے لیکن اس کا تفوق کا وہ تصور وہ نہیں ہے جو مردوں کا ہوتا ہے یعنی وہ دوسروں کی برتری کی قائل نہ ہوگی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری تصور کر کے اپنے پندار تکبّر کی پرورش کرتی رہے گی۔ وہ اپنی خوش قسمتی یا خوش وقتی سے مسرور اور مطمئن نہ ہوگی بلکہ دوسروں کی، بشرطیکہ وہ اس کے رشتہ دار نہیں ہیں، کمزوری یا بدحالی سے مطمئن رہے گی۔

گھر میں اسے کوتوال کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسا کوتوال جس سے بدمعاش اور نیک معاش فکرمند رہتے ہوں۔ شوہر کا شمار ان لوگوں میں ہے، جن کا نام درج رجسٹر نمبر ۱ میں ہوتا ہے۔ پولیس والے اس امر کا پتہ لگایا کرتے ہیں کہ نمبر ۱ قسم کے لوگوں سے کون لوگ ملنے آتے ہیں، یہ کن لوگوں سے ملتا ہے، اس کا اور اس کے ملنے والوں کا ذریعہ معاش کیا ہے، کتنی دفعہ اس کے چالان ہوئے ہیں اور کتنی بار اور چالان ہونے کا امکان ہے، اس سے روپیہ کہاں تک اینٹھے جا سکتے ہیں۔

شوہر کے دوست آئے اور اس نے بغاوت کیا۔ نکمّے، نکھٹو چین ہی نہیں لینے دیتے۔ ہا ہا ہی ہی کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ پان لاؤ، پتّے لاؤ، پانی پلاؤ۔ نہ دن کو عافیت نہ رات کو چین۔ دوست کی آمد کی اطلاع ہو تو شوہر نے باہر جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ نیک بخت بولیں۔ دیکھو چہرے پر بحالی آگئی۔ اب تک تو

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سو کھا کریلا۔ اب وہاں سے حکم چلے گا یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ مجھے کہیں پڑی گری لائے تھے اور کیا یہ اولاد میں اپنے گھر سے لائی۔ اتنے میں کوئی بچہ کوئی مطالبہ یا شکایت لے کر پہنچا اُسے دوہتّڑ، شوہر کو جھگڑا۔

اگر وہ پردہ کی حمایت کرتی ہے تو صرف اس مفاہمہ پر کہ اگر عورت پردہ چھوڑے تو مرد، بالخصوص اس کا شوہر، اسے اختیار کرے۔ یعنی ہر عورت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ آزاد ہو۔ لیکن شوہر کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ سوائے اپنی بیوی کے دوسری عورتوں کی آزادی پر خوش ہو۔ اس میں عورت حق بجانب ہے۔ کیونکہ اس بارے میں بعض مردوں کی بھی ذہنیت یہی ہے کہ اپنی بیوی کے علاوہ ہر عورت آزاد یا بے پردہ ہو تو بہتر ہے۔

عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبّت کی آڑ یا آز میں سب کچھ ہوا۔ جیل خانہ، ہسپتال، فنون لطیفہ، مضمون نویسی، اُمکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں۔

۴۲۰
چارسوبیس

سولہ سترہ سال غیر ممالک میں رہنے کے بعد جب میں ہندوستان واپس آیا تو میں نے ایک اخبار میں "شری ۴۲۰" لکھا تھا، دیکھا۔ میں نے شری رامچندر جی، شری بھگوان تو ہزار دیکھا تھا لیکن "شری ۴۲۰" کے معنی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر یہ خیال کر کے خاموش ہو رہا کہ جس طرح مسلمان چٹھی لکھتے وقت اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے ۷۸۶ سے کرتے ہیں، اسی طرح ۴۲۰ میں کسی متبرک ہستی کا نام ہے جسے الفاظ کی بجائے اعداد میں لکھا جاتا ہے۔

چند روز بعد میں نے ٹرین میں دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ ایک کہہ رہا تھا ارے بھئی تمھارا کوچہ پٹ رنگان والا دوست تو بڑا ۴۲۰ ہے۔ میں یہاں بھی "ابجدی گفتگو" سن کر حیران ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ۴۲۰ کیا بلا ہے؟ آخر جب ہر روز ایک دو دفعہ ۴۲۰ سننے لگا تو مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی شریف آدمی سے اس کا مطلب دریافت کروں۔ آخر ایک روز میں نے ایک شخص سے پوچھ ہی لیا کہ صاحب ۴۲۰ کسے کہتے ہیں؟ اس بھلے مانس نے چیں بہ جبیں ہو کر میرے چہرے کی طرف اس طرح دیکھا گویا میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ تیری

ایسی تیسی، چونسی پینسی۔

لیکن شاید اس کی نظر میری معصومیت کو بھانپ گئی ہوگی، اس لئے اس نے مسکرا کر کہا "حیرت ہے کہ آپ ابھی تک ۴۲۰ نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کبھی کسی ۴۲۰ سے پالا نہیں پڑا"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ ۴۲۰ تعزیرات ہند کی ایک دفعہ ہے جو فریب کاروں اور جعلسازوں پر عائد کی جاتی ہے اور اس دفعہ کے ماتحت انھیں سزا ملتی ہے۔ یہ سن کر میں خوش تو اس لئے ہوا کہ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے اور ہر شخص تعزیرات ہند کی دفعات جاننے لگ گیا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہوا کہ دفعہ ۴۲۰ سے دیہاتی تک بھی آشنا ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب فریب کاری اور جعل سازی بہت عام ہو گئی ہے۔

ایک روز میں دہلی جا رہا تھا۔ ٹرین میں ایک ٹی ٹی صاحب ٹکٹوں کا معائنہ کرنے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے کندھے پر ۴۲۰ لکھا ہے۔ میں نے ازراہِ تفنّن عرض کیا "کہئے بابو ۴۲۰ صاحب، کیا حال ہے؟" بابو صاحب مسکرائے اور بولے "اجی حضرت کیا کیا جائے، خود سرکار نے ۴۲۰ بنا رکھا ہے ورنہ یہ خاکسار تو ۴۲۰ نہیں" یہ دیکھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ جس شخص کا ٹیلیفون نمبر ۴۲۰ ہوگا تو اس بیچارے کی زندگی بھی کیا ہوگی؟ جب وہ کسی کو اپنا ٹیلیفون نمبر بتاتا ہوگا تو سنتے ہی مذاق سمجھتا ہوگا۔ پھر وہ پولیس والا جس کی پٹی پر ۴۲۰ لکھا ہوگا، فریب کاری وارداتوں میں کس منہ سے تفتیش کرتا ہوگا۔ جب وہ کسی

شخص کو دفعہ ۴۲۰ کا ملزم گردانتا ہوگا تو اُسے یہ جواب نہ ملتا ہوگا کہ جناب آپ ۴۲۰ ہیں۔

بہر حال آہستہ آہستہ تجربہ ہوتا گیا تو مجھ پر یہ آشکارا ہونے لگا کہ ملک میں ہر طرف ۴۲۰ کا دور دورہ ہے اور پہلے تو دنیا "بہ امید قائم" ہوا کرتی تھی، لیکن آج کل دنیا بہ ۴۲۰ قائم ہے۔

ایک واقعہ مجھ سے بھی سُنئے، جس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ۴۲۰ کرنے والے بزرگوار ایک روزانہ اخبار کے مالک ہیں جو اپنا مقصدِ زندگی خدمتِ قوم و وطن بتانے کے عادی ہیں اور پھر ۴۲۰ ایسی مکمل ہے کہ نہ کوتوال کا ڈر نہ قاضی شہر کا خدشہ۔

شمالی ہندوستان کے ایک مسلمان بنیئے کو خدمت قوم کا شوق چرّایا اور ایک اخبار نویس کے انگیخت پر اس نے روزانہ اخبار نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ بنیئے کے لئے تو سرمایہ کا سوال مشکل نہ تھا لیکن موزوں چیف ایڈیٹر کا ملنا دشوار تھا۔ اتفاق کی بات کہ ان دنوں ایک مشہور اخبار کا چیف ایڈیٹر علی محمد خاں زندہ بے کار تھا، بلکہ اس کے سابقہ رفقائے کار بھی تلاش معاش میں سرگرداں تھے۔ بنیئے کو پتہ چلا تو اس نے چیف ایڈیٹر صاحب سے ملاقات کی۔ معاملہ کی گفتگو ہوئی اور بنیئے نے کہا کہ صاحب نیا نیا کام ہے، ابھی میں زیادہ تنخواہ نہیں دے سکوں گا۔ اگر آپ سو روپے ماہوار اور منافع کا ۲۰ فیصدی قبول فرمائیں تو کام شروع کر دیا جائے۔ ایڈیٹر نے کہا کہ سوچ کر کل بتاؤں گا۔

ایڈیٹر صاحب نے گھر جاکر بیوی کو مژدہ سنایا کہ لو بلقیس کی ماں کام ہو گیا۔ سو روپے ماہانہ اور منافع کا ۲۰ فیصدی ۔ یوں سمجھو کہ سو روپے سیدھے بنک جایا کریں گے اور منافع دو تین سو روپے سے کم کا ہونے کا نہیں۔ پہلے مہینے ایک ریڈیو سیٹ خریدیں گے اور تم جانتی ہو کہ ایڈیٹر کے لئے ریڈیو سیٹ کس قدر ضروری ہے۔ دن بھر کے دماغی کوفت کے بعد موسیقی کے نغمے اور پھر دنیا بھر کی خبریں۔ بچوں کا پروگرام بھی ہوتا ہے اور پھر جب میں ریڈیو اسٹیشن پر جاکر تقریر براڈ کاسٹ کیا کروں گا، تم گھر بیٹھے سُن سکو گی۔ بلقیس جھٹ میری آواز پہچان لیا کرے گی اور کہے گی "یہ تو ابا بول رہے ہیں"۔

بلقیس کی ماں نے ایک قہقہہ لگایا۔ ایڈیٹر صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "دوسرے اور تیسرے مہینے کے منافع سے ایک قالین خریدیں گے جو بیٹھک میں پورا آجائے۔ تم جانتی ہو کہ ایڈیٹر کی ملاقات کے لئے بڑے بڑے آدمی آتے ہیں اور خالی دری سے رعب نہیں جمتا۔ چوتھے مہینے کے منافع کی رقم جمع کرتے جائیں گے اور چند ماہ کی آمدنی سے ایک موٹر کار خریدیں گے۔ لیکن یاد رکھو تمھارے رشتہ داروں نے بار بار آکر موٹر مانگی تو میں انکار کر دوں گا۔ تمھیں علم نہیں کہ موٹر اسی حالت میں اچھی رہ سکتی ہے جبکہ وہ اپنے ہی استعمال کے لئے مخصوص رکھی جائے۔ لوگ پرائی چیزیں مانگ کر لے جاتے ہیں، لیکن ان کی پرواہ نہیں کرتے اور یہ ہوا مشین کا کام ذرا بے احتیاطی کی اور مشین بگڑ گئی"۔

اچھا تو موٹر کے بعد کیا خریدیں گے؟

بلقیس کی ماں جھنجلا کر بول اٹھی " آپ نے اپنے ہی کام کی چیزیں گن ڈالیں لیکن کچھ میری فکر ہے ؟ کوئی زیور، کوئی کپڑا۔ آپ کے منافع میں کچھ حصّہ نہیں ؟"

ایڈیٹر صاحب بولے " کیوں نہیں، جب یہ ساری چیزیں بن جائیں گی تو پھر تمام منافع تمھارے ہی لئے ہوگا، جو چاہو گی بن جائے گا "

بلقیس نے کہا کہ ابّا میرے لئے بڑی سی گڑیا بھی لاؤ گے ؟ ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا " بچی گڑیا کے لئے پیسے درکار نہیں، ایسی چیزیں اخبار کے دفتر میں ریویو کے لئے مفت آجایا کرتی ہیں "

اگلے دن ایڈیٹر صاحب نے بنیا صاحب کے پاس جاکر رضا مندی کا اظہار کر دیا، معاہدہ لکھا گیا اور اخبار شروع کر دیا گیا۔ ایڈیٹر صاحب نے اپنے پرانے رفقائے کار کو بھی ساتھ لے لیا اور اخبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ پہلا مہینہ ختم ہوا تو بنیا صاحب نے چیف ایڈیٹر صاحب کو تنخواہ دے کر یہ واضح کر دیا کہ منافع سال کے سال تقسیم ہوا کرے گا۔ ایڈیٹر صاحب نے سوچا چلو اکٹھی رقم مل جایا کرے گی، اس میں کیا حرج ہے۔

پہلا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے ایڈیٹر کو بیلنس شیٹ حساب آمد و خرچ دکھا کر کہا کہ پہلے سال تو کسی کاروبار میں منافع ہوا نہیں کرتا۔ آئندہ چل کر انشاءاللہ وارے نیارے ہوں گے۔ ایڈیٹر صاحب نے شیٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جس میں منافع کا خانہ خالی تھا اور ہلکی سی

آہ بھر کر خاموش رہے۔

دوسرا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ کم بخت اکاؤنٹنٹ بڑا سست ہے۔ ابھی تک اس نے حساب ہی تیار نہیں کیا، بہتر ہو کہ اس کو علیحدہ کر کے کوئی ہوشیار اکاؤنٹنٹ رکھا جائے۔ ایڈیٹر صاحب نے اس کی ہاں میں ہاں ملادی اور چند روز ہی دوسرا اکاؤنٹنٹ رکھ لیا گیا۔

اس اکاؤنٹنٹ صاحب نے پرانے اکاؤنٹنٹ کے حساب سمجھنے میں ایک سال اور صرف کر دیا اور جب ایڈیٹر صاحب نے مالک سے حساب دیکھنے کا مطالبہ کیا تو مالک نے کہا کہ حساب تیار ہو رہا ہے، گھبرایئے نہیں۔ غرض ایک سال اور گذر گیا اور حساب تیار نہ ہوا۔ ایڈیٹر صاحب حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ بہرحال اسی ٹال مٹول میں چار سال گذر گئے اور ایڈیٹر صاحب کو منافع کا ایک روپیہ تک وصول نہ ہوا۔ آخر جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بنئے نے کہا کہ صاحب بات دراصل یہ ہے کہ ان چار سال میں ہمیں نقصان ہی نقصان ہو رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو وہ حساب دیکھ لیجئے جو ہم نے انکم ٹیکس والوں کے لئے تیار کیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے جھنجھلا کر کہا کہ لایئے وہی دکھایئے۔ لیکن مالک بولا کہ جناب وہ تاحال تیار نہیں۔ ایڈیٹر صاحب بہت سٹ پٹائے اور انھوں نے دل کڑا کر کے نکتہ چینی شروع کر دی۔

ایڈیٹر:۔ ابھی آپ فرما رہے ہیں کہ چار سال میں کوئی منافع نہیں ہوا

اور آپ یہ بھی ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ آپ نے اپنی تمام پونجی اخبار میں لگا دی ہے۔ پھر یہ جو آپ نے مکان تعمیر کر لیا ہے اس کی لاگت کہاں سے آئی؟

مالک:- مکان بے شک اخبار ہی کی آمدنی سے بنایا گیا ہے لیکن اسے اخبار ہی کا خرچ سمجھئے۔ اگر میرا مکان شاندار ہوگا تو اس سے اخبار ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کلاں کو اخبار پر خرچ کرنے کے لئے مزید روپے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مکان ہے تو جہان ہے۔ ہر جگہ قرض مل سکتا ہے۔ گویا میرا مکان بنانا اخبار ہی پر احسان تو ہے' ورنہ میرے رہنے کے لئے کیا پرانا کھنڈر کافی نہ تھا؟

ایڈیٹر:- اور وہ جو اپنے ایک عزیز کو ولایت بھیجنے پر پانچ چھ ہزار روپیہ ضائع کر دیا؟

مالک:- وہ بھی اخبار پر احسان ہے اور اخبار ہی کے مصارف میں شمار ہوتا ہے۔ کیوں کہ توقع تو یہ تھی کہ میرا عزیز ولایت سے بڑا افسر بن کر آئے گا اور اس کے ذریعہ اخبار کو سرکاری اشتہارات مل جائیں گے۔ یہ قسمت کی بات ہے کہ کامیابی نہ ہوئی ورنہ ارادہ تو نیک تھا۔

ایڈیٹر:- اور آپ نے جو موٹر خرید لی ہے؟

مالک:- (قہقہہ لگا کر) آپ بھی بڑے بدگمان واقع ہوئے ہیں۔ اجی جناب یہ دیکھئے میرا جوتا کس قدر بوسیدہ ہو رہا ہے۔ اگر میں موٹر نہ خریدتا تو پیدل چلتے چلتے یہ جوتا بالکل پھٹ جاتا اور آپ جانتے ہیں کہ نیا جوتا خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ یہ اقتصادی مسائل ہیں، اگر آپ انھیں سمجھ نہیں سکتے تو آپکا قصور

نہیں، تمام اہل قلم کاروباری معاملات میں ایسے ہی ہوتے ہیں ۔

ایڈیٹر :۔ اور آپ نے ایک عزیز کی شادی میں چار ہزار روپیہ کہاں سے صرف کیا ؟

مالک :۔ اخبار کی آمدنی سے اور وہ اس لئے کہ دُلہن مڈل پاس تھی ۔ خیال تھا کہ اخبار کا زنانہ کالم لکھا کرے گی ۔ کیا یہ اخبار پر احسان نہیں اور یہ روپیہ اخبار کی آمدنی سے خرچ نہیں ہونا چاہیے تھا ؟

ایڈیٹر یہ جواب سُن کر دم بخود رہ گیا اور اگلے دن اس نے استعفا داخل کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ نہایت فراخ دلی سے کام لے کر اپنے حقوق و مواجب سے اس نے دست برداری کا پروانہ لکھ دیا ۔ گو جان بچی لاکھوں پائے ۔ اب یہ ایڈیٹر صاحب ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام ۴۲۰ ہو گا ۔

مضامین لق لق

وہ آگئیں

جب سے کالجوں میں تعلیم مخلوط ہوئی ہے، اکثر ادبی رسائل بھی مخلوط ہو گئے ہیں۔ آپ کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی فہرست مضامین پر نظر دوڑایئے۔ اس میں دس نام مرد اہل قلم کے ہوں گے تو دو چار خواتین کے اسمائے نازک بھی نظر آئیں گے۔

کالجوں کی مخلوط تعلیم جس "بے تکلفی" کا موجب بنتی ہے، مخلوط رسائل بھی اسی قسم کی "رواداری" کا باعث بنتے ہیں ـــ زید نے ایک نظم لکھی اور زبیدہ نے ایک افسانہ لکھا۔ دونوں ایک ہی رسالہ میں چھپے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زید اور زبیدہ خود ایک دل چسپ افسانہ بن گئے۔

لاہور میں ایک نامور ادیب کی شادی ایک مشہور ادیبہ سے اسی "مخلوط نویسی" کے باعث ہو چکی ہے۔ ادیبہ نے ایک مضمون لکھا۔ ادیب نے اس کے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اسی طرح ایک دوسرے پر دو تین وار ہوئے اور دونوں شہید ہو کر رہ گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ بیوی خاوند

بن گئے اور وہ رسالہ جن میں ان کے مضامین چھپتے تھے اچھا خاصہ شادی ایجنسی ثابت ہوا۔

ہمارے ارشد مرزا بھی اسی مخلوط نویسی کا شکار ہیں۔ ایک ادبی رسالہ میں ان کی اور ایک دہلوی لڑکی مس رفیقہ کی نظمیں چھپتی رہیں اور رفتہ رفتہ دونوں ہم قافیہ مصرعے بن گئے۔ لیکن وزن میں ذرا فرق تھا، اسی لئے دونوں نے فعولن معولن کی رٹ لگا کر عرصۂ دراز میں درست کیا۔ مرزا ارشد کی راہ میں یہ مشکل حائل تھی کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ تین چار بچوں کے باپ بھی تھے۔ بہر حال مصرعہ ثانی نے مصرعہ اولیٰ کا یہ "ایطائے جلی" قبول کر لیا اور یہ طے پایا کہ کیوں نہ دونوں مصرعوں کو ملا کر ایک مکمل اور موزوں شعر بنا دیا جائے۔

حسب تجویز ارشد مرزا نے اپنے بھائی کو تار بھیجا جو حسب ذیل تھا:۔
"All well Come Immediately." یعنی ہر طرح خیریت ہے، آپ فوراً تشریف لایئے۔ ارشد مرزا نے 'ہر طرح خیریت' کے الفاظ اس لئے جوڑ دیئے تھے کہ کہیں بھائی صاحب پریشان نہ ہو جائیں کہ کیا معاملہ ہے۔ ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں، صرف آپ اکیلے آ جایئے۔ لیکن گاؤں میں تار کا آنا ایک مصیبت ہوتا ہے۔ ہر چند آصف مرزا لکھے پڑھے آدمی تھے اور تار میں صاف لکھا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ لیکن آپ گھبرا گئے کہ خدا جانے بھائی پر کیا مصیبت آ پڑی ہے۔ اسی گھبراہٹ میں آپ نے تار کو ارشد مرزا کے سسرال روانہ کر دیا جہاں ارشد مرزا کے بال بچے

گئے ہوئے تھے اور ستم یہ کیا کہ تار کا اُردو ترجمہ نہ لکھ بھیجا۔ اب یہ چھوٹا سا گاؤں جس میں ایک پٹواری اور ایک مدرس۔ لڑکا تار لئے پٹواری کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ میں رومن کیرکٹر تو جانتا ہوں اور ان حروف کو پڑھ سکتا ہوں لیکن معنی نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ ایک لفظ کے معنی جانتا ہوں اور وہ "لاہور"۔ یہ تار لاہور سے آیا ہے۔

گاؤں میں تار آجائے تو گھر گھر میں گھبراہٹ پھیل جاتی ہے اور بعض اوقات اور کوئی رشتہ دار بیمار ہو یا لڑائی وغیرہ میں گیا ہوا ہو تو تار پڑھائے بغیر رونا پیٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ ارشد مرزا کے گھر والوں میں بڑی پریشانی پھیل رہی تھی کہ مجید مرزا آگئے جو ارشد مرزا کے رشتہ دار تھے اور زمیندارہ بینک کے اڈیٹر تھے۔

لڑکے نے تار دے کر کہا کہ بھائی اس تار کو نہ پٹواری پڑھ سکا، نہ مدرس۔ مجید مرزا بولے "اجی واہ تار کا پڑھنا کوئی آسان کام ہے؟ اس کے لئے قابلیت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں حروف حذف کر کے اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور حذف شدہ الفاظ کو جان لینا ایسے ویسوں کا کام نہیں۔ اگر پٹواری اور مدرس تار پڑھنے لگیں تو ہم انٹرنس پاس لوگوں کو کون پوچھے؟"

مجید مرزا نے عینک نکالی اور اپنے آنکھوں پر لگا کر تار کو بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ بلند آواز سے اس لئے کہ انھیں اپنی انگریزی دانی کا لوہا منوانا تھا۔ پہلا لفظ All اس کے معنی ہیں سب کے سب یا تمام۔ اس کے آگے Well یہ فالتو لفظ ہے۔ انگریز اکثر اُردو بولتے وقت بھی اس کو

استعمال کیا کرتے ہیں۔ مثلاً ویل تمھارا کیا نام ہے؟ اس کے بعد ہے
come Immediately اس کے معنی ہے فوراً چلے آؤ۔ تو
سارے تار کا یہ مطلب ہوا کہ سب کے سب چلے آؤ۔

اب ارشد مرزا کی سنئے۔ وہ اپنے گھر دو تین ہمزاد دوستوں میں بیٹھے
نئی شادی کے متعلق گپ شپ ہانک رہے تھے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دیکھئے
آخر خدا وہ وقت لے ہی آیا کہ میرے دل کی مراد پوری ہونے کو ہے۔ بھائی جان
بس آ ہی رہے ہوں گے۔ وہ آئے اور میں انھیں لے کر دہلی پہنچا اور پھر سمجھ
لیجئے کہ وہ بھی آگئیں — میری نئی بیگم صاحبہ۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ارشد مرزا باہر نکلے اور
پھر اندر آکر دوستوں سے کہنے لگے۔ اب آپ تشریف لے جائیں، وہ آگئیں۔

الطاف:— وہ کیسے آگئیں؟ ابھی تک آپ کے بھائی صاحب تو
آئے نہیں اور آپ دہلی گئے نہیں، وہ کیسے آگئیں؟

ارشد مرزا:— ارے وہ آگئیں — وہی پرانی بیگم صاحبہ۔

آنریری مجسٹریٹ

اب یوں کہنے کو تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، جوائنٹ مجسٹریٹ، اسپیشل مجسٹریٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ، سب، مجسٹریٹ ہی کہلاتے ہیں۔ مگر آنریری مجسٹریٹ والی بات ان بچاروں کو کہاں نصیب — اور سچ پوچھئے تو یہ بات وہ چاہیں بھی تو ان میں آ نہیں سکتی، اس لئے کہ یہ لوگ ٹھہرے تنخواہ دار ملازم۔ اب آپ ایک نوکر پیشہ مجسٹریٹ کو ایک اعزازی مجسٹریٹ کے سامنے لا کھڑا کر دیجئے گا تو آنریری مجسٹریٹ کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟ ان غریبوں کو صرف اپنی ڈیوٹی ادا کرنے اور تنخواہ پانے سے کام اور یہاں بچالے بھلے آدمیوں میں عزت و آبرو پیدا کرنے کے سوا اور کوئی خیال نہیں۔

اس کو ہم مانتے ہیں کہ آنریری مجسٹریٹ ہی کی طرح یہ ملازمت پیشہ والے مجسٹریٹ بھی ایک قسم کے حاکم ہیں۔ مگر یہ چیز ہی اور ہے، اس سے اس کو کیا نسبت۔ وہاں بات بات پر جواب دہی اور قانونی بازپرس اور یہاں کسی بات کی پابندی ہی نہیں، ایک دم مطلق العنانی۔ وہاں تیس دن کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہیے اور یہاں کبھی کبھار ہفتہ دو ہفتہ میں اجلاس پر جاکر مجسٹریٹی

کی شان دکھلادی اور بس - وہاں کلکٹر کی جھڑپ، کمشنر کی ڈانٹ، جج کے ریمارک کا ہر وقت خوف اور یہاں کلکٹر صاحب کے سوا کسی کی کیا مجال کہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے - ان تھرڈ کلاسی مجسٹریٹوں کو چھوڑیئے - آپ کسی فرسٹ کلاس کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی سے بھڑا لیجئے - توبہ کیجئے، کیا واسطہ! یہ بھی کوئی مجسٹریٹی ہوئی کہ صبح اُدھر ہوئی نہیں اور بستوں کا پلندہ دستخط کرنے کے لئے سامنے لاکر رکھ دیا گیا اور قلم خاص شروع ہو گیا - غریب مجسٹریٹ کیا ہوا کہ دستخط کرنے کی مشین - ادھر گیارہ بجے، جلد جلد ٹفنایا اور پہنچ گئے کچہری - وہاں بھی پھر وہی دستخط بازی - اس سے فرصت ملی تو اب مقدمہ کی سماعت شروع ہو گئی - چار بجے تک وکیلوں کے قانونی ردّ و قدح، بیرسٹروں کی بحثا بحثی میں سر کھپاتے رہے - اجلاس سے بدحواس کوٹھی پر پہنچے - غسل کر کے چائے کی پیالی پوری ختم بھی نہ کر پائے کہ کوتوالی سے کسی نے فون کیا کہ ہڑبونگیوں نے بہت بڑا جلوس نکالا ہے - فوراً آرڈی نینس کا احترام کرانے کے لئے دوڑے کوتوالی - ہو ہڑپ اور دھر پکڑ سے جلوس منتشر کرنے کے بعد پھر اپنے بنگلہ پر پہنچے - کلب جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک دیہات میں بہت بڑے بلوے کے احتمال کا تار پہنچا - جس میں فوری امداد کی استدعا تھی - فوراً ایس - پی اور ایک لاری ملٹری کو ساتھ لئے جائے وقوعہ پر روانہ ہو گئے - وہاں پہنچ کر ہوائی فیر سے رعب جمانے اور ایک دو گھنٹہ رہ کر سب انتظام درست کرنے کے بعد راتوں رات وہاں سے واپس ہو کر صبح ہوتے ہوتے پھر اپنی کوٹھی پر پہنچے - غسل اور چائے سے فرصت کر کے تھوڑی دیر مسہری

پر آرام کرنے کے خیال سے لیٹے ہی تھے کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے فون کیا کہ آرڈی ننیس شنگموں نے جیل کے احکام کی خلاف ورزی اور جیل کے اندر ہڑبونگ شروع کر دی ہے۔ نیند سے بدحواس اور تکان سے چور دلے برانداش اسی حالت میں شاہی مہمانوں کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ ڈانٹ ڈپٹ، سمجھا بجھا کر کوٹھی پر جب واپس آئے تو دیکھا کہ خواہ مخواہ سلام بجانے والوں کی اچھی خاصی تعداد دق کرنے کے لئے برآمدہ میں موجود ہے۔ بغیر سلام لئے اور غصہ میں ان لوگوں سے منھ پھیرے آفس روم میں پہنچے۔ پھر وہی دستخط مشق کرنے والی وصلیوں یعنی فاعل کا ڈھیر میز پر موجود۔ یہ ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹی۔ نہ اطمینان سے کھانا میسّر، نہ چین سے سونا نصیب اور اس کا آپ چلے ہیں آنریری مجسٹریٹی سے مقابلہ کرنے۔ جس میں نہ کوئی کام نہ دھندا۔ نہ کوئی ذمّہ داری، نہ اس کا احساس۔ بلا دردِ سر مفت میں مجسٹریٹ بنے شان سے بیٹھے ہیں۔

وہ تو خدا کو اچھا کرنا تھا کہ بچپن ہی سے انگریزی تعلیم کے بکھیڑے سے ہم الگ رہے ورنہ خدانخواستہ کہیں گریجویٹ ہو جاتے تو کلکٹر صاحب، خدا ان کو تا حیات زندہ رکھے، جس مہربانی کی نظر رکھتے ہیں اور اپنے عزیز خانساماں سے کسی طرح کم نہیں مانتے، یقینی ڈپٹی نہیں تو سب ڈپٹیوں میں ضرور بھرتی کرا دیتے اور یہ آج جو خدا نے آنریری مجسٹریٹی کے ہائی پوزیشن پر پہنچا دیا ہے، ہمیشہ کے لئے اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہ جاتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر اور کلکٹر صاحب کا ہزار ہزار احسان کہ ہم جیسے خاکسار، ذرّہ

بے مقدار، گناہگار، سیاہ کار، بداطوار و بدکردار کو اتنا بڑا درجہ عطا فرما کر صاحبِ اختیار و الاقتدار بنا دیا۔ (یاد رہے کہ انکسارًا اور قافیہ کی وجہ سے بھی بعض الفاظ ہماری زبان سے نکل گئے جس کو آپ سچ مچ نہ سمجھ جائیں ؎

اگر ہووے اس کے کرم کی نگاہ
گدا کو بنا وے ابھی بادشاہ

بعض پرانے نسخوں میں گدا کے الف میں ہائے ہوز بھی لپٹی ہوئی ہے۔)
لیکن جناب! یہ اعزازی عہدہ جیسی قابلِ رشک، عزت کی چیز ہے اسی قدر اس کا حصول دقّت طلب اور دشوار بھی ہے۔

یہ ڈپٹی مجسٹریٹی کی طرح آسان نہیں کہ صرف گریجویٹ ہو گئے اور دو چار مہینے دوڑ دھوپ کر دس بیس سارٹیفکیٹ حاصل کر لئے اور کچھ دنوں بڑے بڑے حکام اور با اثر لوگوں کی آستان بوسی اور منت و خوشامد کر کے، سعی و سفارش پہنچا کر کلکٹر صاحب کے یہاں سے اُمیدواروں میں نام بھجوا دیا۔ اس کے بعد کمشنر اور انتخابی بورڈ کے ممبروں کی کوٹھیوں کے چکر لگانے میں کچھ وقت صرف کیا۔ غرض چھ سات ماہ کی خاک بسری اور بڑے بڑے لوگوں کی آستان بوسی وغیرہ کے بعد اگر قسمت نے یاوری کی تو آدمی سے ڈپٹی مجسٹریٹ بن گئے۔ ورنہ پھر آئندہ سال کوٹھیوں اور بنگلوں کا طواف شروع کر دیا۔ اگر دوسرے سال بھی قسمت آزمائی بے نتیجہ رہی تو زیادہ سے زیادہ اور دو ایک سال دوڑ دھوپ کے بعد کامیاب یا اُوَر یج

(OVERAGE) ہو کر اطمینان سے بیٹھ رہے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ آنریری مجسٹریٹی کے اُمیدواروں کی طرح دس دس پندرہ پندرہ برس تک صبر آزما انتظار تو نہیں کرنا پڑتا۔ پھر اس زمانۂ امیدواری میں مسلسل ہر ہفتہ صاحب کے یہاں کی بلاناغہ حاضری افسران اعلیٰ کی خوشامد، کبھی کبھی حکام کی دعوت، ڈالیوں کا نذرانہ، سرکاری فنڈ میں چندہ دینا اور دلوانا اور ساتھ ہی اس کے سی۔آئی۔ڈی کی آنریری ڈیوٹی ادا کرنا۔ ان فدویانہ خدمات کے علاوہ سب سے بڑھ کر جو مشکل چیز ہے وہ تحمل و برداشت و بےنفسی کی آزمائش۔ جس میں بڑے بڑے نیازمندوں کے پاؤں بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

چنانچہ خود ہمارے ساتھ اتفاقی طور سے ایک ایسے امتحان کا موقع پیش آ گیا جس کے باعث قریب تھا کہ ہم راہِ طلب سے بھٹک جائیں، وہ تو خدا نے بڑا فضل کیا کہ اس سخت آزمائش میں بھی ہم ثابت قدم رہے ورنہ غیرت و خودداری کے جذبہ نے تو سارا کام ہی بگاڑ دیا تھا۔ چونکہ آنریری مجسٹریٹی کے مستقل عہدہ پر بحال ہو چکے ہیں اس لئے اب اس کے کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ قصّہ یوں ہے کہ حسب معمول ایک روز سلام بجا آوری کی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے کوٹھی پر حاضر ہوئے، اب ہمیں کیا معلوم کہ میم صاحب نے ڈانٹ بتائی ہے اور صاحب اس وقت عتاب زدہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے جیوں ہی کوٹھی کے سائبان میں قدم رکھا، نظر پڑتے ہی صاحب نے غرّا کر چپراسی کو بلایا۔ خدا جانے اس سے کیا کہا کہ غریب کو ہمیں کوٹھی کے احاطہ سے باہر تک عزت و آبرو کے ساتھ

پہنچانا پڑا۔ چپراسیوں کو انعام دیتے رہنے کا فائدہ اس روز معلوم ہوا۔ اب اس کو غیرت کا تقاضا کہئے یا اپنے دل کی کمزوری کہ اِس خلاف امید واقعہ کا فوری طور پر ہم پر ایسا اثر پڑا کہ تھوڑی دیر تک ہم عزت کی زندگی اور ذلّت کی موت جیسے نازک مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس جگہ سوائے چپراسی کے کوئی اور دوسرا موجود نہ تھا ورنہ اس خبر کے پھیل جانے سے عوام کی نظروں میں ہمارا پوزیشن ذرا نازک ہو جاتا۔ بات اصل یہ ہے کہ بے عزتی اور توہین اس وقت زیادہ ناقابل برداشت چیز ہو جاتی ہے جب دوسرے لوگ بھی جان جائیں۔ ورنہ "ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا" والا مضمون ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارا واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہو کر رہ گیا اور ایک ہمارے ساتھ کیا بہت سے فرسٹ، سکنڈ پاور والوں کے ساتھ بعض وقت اپنے اعلیٰ افسروں کی کوٹھیوں پر ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو کسی کے نہ جاننے کی وجہ سے توہین کے تحت میں آ ہی نہیں سکتے۔

تو خلاصہ گذارش فدوی یہ ہے کہ اس اعزازی عہدہ کے حصول میں اکثر اس طرح کے ہمّت شکن حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر طلب صادق ہے تو نہایت ہی عقیدت مندانہ استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ آدمی اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صاحب نے آنریری مجسٹریٹی کے لئے ہمارا نام زوردار سفارش کے ساتھ بھیج دیا اور قبل اس کے کہ ہمارا نام گزٹ میں نکلے اور آنریری مجسٹریٹی کا ڈبل یا

سنگل پاور ملے، جب تک ریزرو پاور کا حاکم یعنی اسیسر بنا دیا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد خدا کے فضل، کلکٹر صاحب کی مہربانی اور دوستوں کی دعا سے یہ غلام کفش بردار حکام آستانہ بوسی افسران عالی مقام آنریری مجسٹریٹی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز المرام ہو گیا۔

پہلے پہل جس روز ہم اپنے برابر کے شریک دار آنریری مجسٹریٹ کے ہمراہ اپنے اجلاس پر پہنچے، چپراسی، پیش کار، مدعی، مدعا علیہ، گواہان اور مختار صاحبان نے تعظیماً کھڑے ہو کر جیسے فدویانہ انداز سے سلام کیا، اس کا لطف کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ہم دونوں بھی ہائیکورٹ کے ججوں کی طرح حاکمانہ انداز میں سر کے اشارہ سے جوابِ سلام دیتے ہوئے اپنی کرسئ عدالت پر رونق افروز ہو گئے۔ اردلی کا باضابطہ وردی میں سامنے کھڑا رہنا، مدعی کا دست بستہ دُہائی دینا، مدعا علیہ کا رحم طلب نگاہوں سے دیکھنا، فریقین کے مختاروں کا "حضور عالی! غریب پرور" بار بار دُہرانا ایسا سرور بخش، روح پرور سماں تھا کہ ہمارا تو خیال ہے کہ اور تو اور گاندھی جی بھی ایک بار اگر اس روحانی لذّت سے آشنا ہو جائیں تو گول میز کانفرنس یا آشرم یا جیل جہاں کہیں بھی گئے ہوں وہاں سے فوراً پہنچ کر اس خود اختیاری حکومت پر قبضہ کر کے نہایت ہی ٹھاٹھ کے ساتھ لنگوٹی باندھے ہوئے آنریری مجسٹریٹی شروع کر دیں۔ ہماری بات مانی جائے تو گورنمنٹ کو یہ

خیر خواہانہ مشورہ دیں گے کہ کہاں مصالحت وغیرہ کے پھیر میں پڑی ہے، گاندھی جی کو صرف آنریری مجسٹریٹی دے دے پھر دیکھیے کہ خود بخود کیسے وفادار جی حضوری بن جاتے ہیں۔ کیونکہ مجسٹریٹی ایک ایسا مفرحِ قلب و دماغ اور مقوّیٔ اعضائے رئیسہ و خبیثہ و مصلحِ خیالاتِ فاسدہ ٹانک ہے کہ صرف ایک بار کے استعمال سے سارے جراثیم سرکشی ہمیشہ کے لیے نابود ہو جاتے ہیں۔ گاندھی جی کو بھی ہم یہی صلاح دیں گے کہ فضول لیڈری کی خاطر گورنمنٹ کو دق اور پبلک کو پریشان کر رہے ہیں۔ لیڈری میں، اور ہم تو کہتے ہیں سوراج میں بھی، آنریری مجسٹریٹی سے زیادہ تھوڑا ہی مطلق العنانی ہے۔ سوراج کے متعلق تو بالفعل ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر آنریری مجسٹریٹی کا تو ہمیں ذاتی تجربہ ہے کہ قانون کے اندر یا باہر جس کو چاہیے سزا دیجیے، جرمانہ کیجیے، قصور معاف کر دیجیے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایک دم سولہ آنہ سوراج۔

گورنمنٹ نے ادنیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار تک کو جتنے اختیارات دیئے ہیں، سب کے ساتھ قانونی واقفیت کی بھی پخ لگا دی ہے۔ داروغہ سے لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تک کے لئے قانونی واقفیت لازمی۔ لیکن ازراہ بندہ نوازی صرف آنریری مجسٹریٹ کو اس سے ایکزمٹ (مستثنیٰ) رکھا۔ بلکہ ہم ہی نمک خواروں کے خیال سے گورنمنٹ نے آنریری مجسٹریٹی کے لئے قانونی ناواقفیت کو کوالیفکیشن قرار دے کر بیرسٹر و کلا یعنی قانونی

واقفیت رکھنے والوں کو ڈس کوالیفائڈ (ناقابل) کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنریری مجسٹریٹی کے اجلاس پر ہم جیسے تعلیمی الجھنوں سے دور رہنے والے نیاز مندوں کی صورت نہ دیکھتے اگر دیکھتے تو اناڑی سمجھ کر ایک دم اور کھٹائی میں پڑ جاتے۔ یہ سب سہی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر قانونی واقفیت نہیں نہیں ہے تو وکلاء اور مختاروں کے سمجھانے سے کچھ زیادہ ہی سمجھ جاتے ہیں اور اپنی طباعی سے ہم خود ہی قانون کے وہ وہ نکات پیدا کر لیتے ہیں کہ جس کے باعث مختاروں کا ناک میں دم رہتا ہے اور وکلاء تو بد حواس رہتے ہیں۔

چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ سڑک پر استنجا کرنے کا ایک مقدمہ ہمارے اجلاس میں پیش ہوا۔ مدعا علیہ کے مختار نے بحث شروع کی:-

حضور عالی! فرد جرم لگانے کے پہلے جرم کا موٹیو (Motive) اور مدعا علیہ کی نیت کو دیکھنا ضروری ہے۔ فریق نے یہ نہیں ثابت کیا کہ اس جرم کا موٹیو سڑک کو نقصان پہنچانا تھا اور نہ اس کی کوئی شہادت پیش کی گئی کہ راہ گیروں کی نگاہِ غلط انداز سے بھی ان کی شرم و حیا کو صدمہ پہنچا اور نہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ فعل عمداً کیا گیا یا مدعا علیہ جائے وقوع پر اسی نیت سے گیا۔ ان میں سے کسی بات کا ثبوت مِسل میں موجود نہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ مدعا علیہ سلسل بول یا ذیابیطس یا مثانہ کی کمزوری کے باعث ضبط نفسی پر قادر نہ رہ سکا اور مجبوراً تقاطر نے موسلا دھار کی

صورت اختیار کر لی ہو، جس کے باعث سڑک پر یہ تھوڑی سی آب پاشی اضطراراً ہو گئی۔ حضور پر خوب روشن ہے کہ اہلِ رقّت سے ضبط کے باوجود آنسو ٹپک تو رکتا ہی نہیں اور یہ تو استنجا کا معاملہ ہے اور پھر حضور نے بڑی بڑی خطائیں معاف کر دی ہیں، یہ پیشاب خطا ہونا تو کوئی ایسی بڑی خطا بھی نہیں۔ اب حضور کے ہاتھ میں ہے۔ پکڑنے یا چھوڑنے کا پورا اختیار ہے۔

یہ قانونی اور مدلّل بحث سُن کر ہم نے اپنی ذہانت سے مختار صاحب کو ایسا قائل کر دیا کہ وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ کوئی آنریری مجسٹریٹ ہے۔ ہم نے کہا کہ مختار صاحب! بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ایک بار دو بار کا قصہ ہو تو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ کئی دفعہ آپ کے مؤکل نے یہی حرکت کی ہے۔ مختار صاحب نے جلدی سے کہا کہ حضور یہ پہلا قصور ہے۔ ایک دفعہ سے دوسری دفعہ ثابت ہو جائے تو جو سزا چاہیں حضور دیں۔ ہم نے کہا کہ کم از کم چھتیس دفعہ تو پولیس کی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے اور اس کو آپ بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ یہ سُن کر مختار صاحب چپ ہی تو ہو گئے۔ دبے لفظوں میں صرف یہ کہا کہ اب میرے مؤکل کا خدا ہی حافظ ہے۔

ایک روز کا اور ذکر ہے کہ دفعہ ۱۴۷ میں بلوہ کا ایک مقدمہ ہمارے سامنے پیش ہوا اور ایک وکیل صاحب اس دفعہ کا منشا سمجھانے

میں قانونی قابلیت کا گُن اظہار کرنے۔ ان کی ضد پر دوسرے روز ایک وکیل دوست کے یہاں ہم نے قانون کی کتاب منگوائی اور دفعہ ۱۴۷ پڑھوا کر اچھی طرح سمجھ لیا اور اس صفحہ پر نشان لگا کر اپنے ساتھ لئے ہوئے اجلاس پر پہنچے۔ وکیل صاحب کی بحث کے بعد ہم نے حسب ذیل فیصلہ لکھا:—

"چونکہ اس دفعہ کو نابالغ یا پاگل لوگوں سے تعلق ہے اور ایسے لوگ قابلِ معافی ہیں، اس لئے مقدمہ ڈسمس۔"

وکیل صاحب یہ فیصلہ پڑھ کر بوکھلا گئے اور کہنے لگے دفعہ ۱۴۷ بلوہ کے مقدمہ میں یہ نابالغ اور پاگل کا سوال کہاں سے پیدا ہوگیا؟ ہم نے حاکمانہ انداز سے تیور بدل کر قانون والی کتاب جو نشان دے کر ساتھ لائے تھے کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب جو دفعہ ۱۴۷ میں یہی مضمون صاف لکھا ہوا انھوں نے پڑھا تو مخبوط ہو کر لگے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے۔ ہم نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر کہا کہ آپ لوگ کتاب پڑھ کر تو آتے نہیں اور مفت میں مؤکل کا روپیہ اور حاکم کا وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ جملہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ وکیل صاحب نے تمسخر انگیز انداز سے ہنس کر کہا کہ حضورِ عالی! یہ کتاب سِول پروسیجر کوڈ ہے۔ اس دفعہ ۱۴۷ کو تعلق دیوانی عدالت سے ہے اور آپ کی زیرِ تجویز فوجداری کا دفعہ ۱۴۷ ہے۔ یہ سُن کر پہلے تو ہم ذرا جھینپ سے گئے۔

مگر اپنی بات کی پچ رکھنے کے لیے "حاکم ہارے منھ پر مارے" کے اصول پر بگڑ کر کہا کہ عدالت دیوانی ہو یا پاگل ہم کو اس سے بحث نہیں، یہ بھی تو آخر سرکار ہی کا قانون ہے، کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں اور اس کے علاوہ قانوناً فیصلہ صادر ہونے کے بعد کوئی عذر قابل سماعت نہیں۔

لہٰذا مقدمہ ڈسمس پنڈ نہیں بلکہ ایک دم ڈِسمس۔

اسی طرح ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم اجلاس پر آنریری مجسٹریٹی کر رہے تھے کہ بے نشان وگمان ہیٹ۔ سوٹ پہنے ایک صاحب بہادر ہمارے اجلاس پر پہنچ گئے۔ یہ سمجھ کر کہ کوئی افسرِ اعلیٰ ملاحظہ کے لئے تشریف لائے ہیں، نظر پڑتے ہی ہم اور ہمارے ساتھی دونوں گھبرا کر تعظیماً کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باضابطہ فوجی سلام بجا لائے۔ لیکن جب ایک مختار صاحب نے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ آپ حال ہی میں انگلینڈ سے بیرسٹری پاس کر کے آئے ہیں اور حضور کے اجلاس میں ایک مؤکل کی طرف سے کام کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں، تو فوراً کرسی پر ہم بیٹھ گئے اور اس غلطی کی تلافی کے خیال سے حاکمانہ انداز سے کہہ دیا۔ اول رائٹ یس گو آن۔ اب تازہ وارد بیرسٹر صاحب اپنی بیرسٹری کے زعم میں یا یہ سمجھ کر کہ عدالت انگریزی زبان جانتی ہے، صاحبی زبان میں مقدمہ سمجھانے لگے۔ ہم عجیب مشکل میں پڑ گئے کہ اگر صاف صاف کہہ دیں کہ ہم دونوں انگریزی نہیں جانتے تو یہ ذرا حاکمانہ شان کے

خلاف معلوم ہوتا تھا اور اگر اسی طرح ان کو انگریزی میں بولنے کے لئے
چھوڑ دیں تو ایک حرف سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر یہ سوچ کر کہ یہاں سمجھنے اور
نہ سمجھنے پر تھوڑا ہی فیصلہ موقوف ہے۔ انگریزی نہ جاننے کا حال کہہ کر کیوں
پردہ دری کی جائے اور پھر ایک دم ایسے بھی نہیں جو کچھ سمجھ نہ سکیں۔
خدا اگر جھوٹ نہ بلوائے تو بیسیوں انگریزی الفاظ کے معنی ہم جانتے
ہیں۔ مجسٹریٹ، کورٹ، آرڈر، چیف کراس، لائن وغیرہ وغیرہ۔
اس قسم کے اور بھی الفاظ یاد ہیں۔ چنانچہ بیرسٹر صاحب کی تقریر کے
الفاظ یور آونر، مائی کلائنٹ، نو پروف یہ سب ہم سمجھ ہی رہے
تھے۔ بولتے بولتے وہ ایک جملہ یہ بول گئے "آئی اپیل ٹو یور جسٹس"
ہم سمجھ گئے کہ یہ حضرت جسٹس کے یہاں اپیل کی دھمکی دے رہے ہیں۔
دل میں کہا کوئی پروا نہیں جسٹس، چیف جسٹس یا پریوی کونسل ہی میں
اپیل کر کے ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔

تنخواہ یا بھتہ ہم تھوڑے ہی پاتے ہیں جو ان باتوں سے ڈر جائیں۔
جرمانہ ٹھونک کھونک کے ہم سرکار کو اس قدر روپیہ دلاتے ہیں۔ اس
میں سے کچھ کمیشن ملتا تو جانتے کہ ہاں اک رقم ہے۔ اس دھمکی پر آ گیا
ہمیں غصہ۔ ہم نے کہا کہ جناب بیرسٹر صاحب! یہ کسی ڈپٹی وغیرہ کا اجلاس
نہیں ہے کہ قانون اور بحث سے قائل کر کے آپ مقدمہ جیت جائیں۔
قانون وغیرہ تو یہاں رہنے دیجئے۔ باقی رہی بحث کی بات تو آج تک
بحث سے بھی کوئی بات طے ہوئی ہے۔ مذہبی جھگڑے تو بحث مباحثہ

سے طے نہیں پاتے اور یہ تو مقدمہ ہے۔ یہ سن کر ایک مختار صاحب نے، جو ان کے ساتھ تھے، ہمارا تیور دیکھ کر بیرسٹر صاحب کو تو بیٹھنے کے لئے کہا اور ان کی اجازت سے خود بحث شروع کر دی۔ مختار صاحب نہایت ہی موقع شناس تھے۔ ان کی بحث ہمیں بہت پسند آئی۔ انھوں نے کہا حضور کی قابلیت، ذہانت اور قانونی واقفیت کے سامنے کس کی مجال ہے کہ لب کشائی کر سکے۔ حضور عالی کا ہر ہر لفظ خود ایک قانون ہے۔ ہمارے مؤکل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسے حاکم کے یہاں مقدمہ آیا ہے جس کی عدل گستری اور انصاف پروری کی دھوم ہے۔ جب تو سرکار نے بھی اتنا بڑا درجہ دیا ہے کہ جس کی جو سزا چاہیں دیں یا چھوڑ دیں۔ ہمیں اپنے مؤکل کی بے گناہی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور خود روشن ضمیر ہیں۔ آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ ہمارے مؤکل کی جان بخشی حضور کے ہاتھ میں ہے۔ حضور جان و مال کے مالک و مختار ہیں ـــ یہاں تک کہ بحث کے آخر میں اوپر خدا اور نیچے ہم ہی دونوں مجسٹریٹ رہ گئے۔ ہم نے بیرسٹر صاحب سے کہا کہ دیکھا آپ نے؟ اس کو بحث کہتے ہیں کہ پتھر کا بھی حاکم ہو تو موم کی ناک ہو جائے۔

ایک مقدمہ کا حال اور سن لیجئے! چند شخصوں پر دفعہ ۱۴۳ ـــ مجمع ناجائز ـــ اور دفعہ ۱۶۰ ـــ سڑک پر لڑائی جھگڑا کرنے ـــ کے دو جرموں میں دو دفعات قائم کر کے مقدمہ چلایا گیا تھا۔ ہم نے مدعا علیہ کے مختار سے کہا کہ دو دو دفعات کے اظہار، جرح اور بحث میں بہت طول ہوگا،

اس لئے ہماری رائے ہے کہ ایک ہی دفعہ قائم کر کے مقدمہ تجویز کیا جائے، تو آپ کو بھی آسانی ہوگی اور عدالت کا بھی وقت بچے گا۔ مختار صاحب نے پہلے تو خوش ہو کر ہماری عاقلانہ تجویز کی بڑی تعریف کی۔ لیکن جب ہم دفعات ۱۴۳ اور ۱۶۰ دونوں کو جوڑ کر ۳۰۳ کا ایک ہی دفعہ قائم کرنے لگے تو لگے مختار صاحب شور کرنے کہ حضور کیا غضب کر رہے ہیں، یہ تو خون کا دفعہ ہے۔ ہم نے کہا تو کیا ہرج ہے۔ فیصلہ تو ہمارے ہی ہاتھ میں ہے اور یوں اگر آپ کہئے تو آپ کے خیال سے رعایتہً اسی دفعہ میں اور کچھ گھٹا دیں اور بجائے دفعہ ۳۰۳ کے ۳۰۲ بنا دیں۔ اس پر انھوں نے اور ہنگامہ شروع کر دیا کہ یہ تو اس سے بھی بڑھ کر قتل در قتل ہو جائیگا۔ ان دفعات کے مقدمات کا آنریری مجسٹریٹ کیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی تجویز کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ سشن کیس ہے۔ جج کے سوا کوئی دوسرا حاکم اس کی سماعت کر ہی نہیں سکتا۔ ہم نے کہا کوئی پروا کی بات نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسیسر بھی ہیں۔ بیسیوں سشن کی سماعت ہم نے کی ہے۔

مختار صاحب تو صدائے احتجاج بلند ہی کر رہے تھے۔ کورٹ انسپکٹر ان کے فریق نے بھی اس معاملہ میں انھیں کا ساتھ دے دیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ دونوں آپس میں مل گئے ہیں۔ اسی غصّہ میں ہم نے اس کیس کو ڈسمس کر دیا۔ ہم عموماً ایسے مقدمات جن میں اس طرح کی قانونی پیچیدگیاں ہوتی ہیں، اکثر اس خیال سے ڈسمس کر دیا کرتے ہیں کہ کون اس قانونی

جھنجھٹ میں پڑے۔ ہمیں لینا ایک، نہ دینا دو۔ نہ تنخواہ کی لالچ، نہ بھتّہ کی
اُمید۔ پھر خواہ مخواہ کی دردسری کیوں مول لیں اور یوں کسی نے ہمارے
اجلاس سے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں فیصلہ کے قبل ہی محض دوستانہ پیشگی
مٹھائی کھلادی یا نقدی دعوت کردی تو اس کو قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ باقی
رہی عزّت، تو گزٹ میں نام چھپ جانے کے بعد کون شریف آدمی آنریری
مجسٹریٹ کے اعلیٰ پوزیشن سے انکار کر سکتا ہے۔ ہم ان ناقدر دانوں
کو نہیں کہتے جو اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہنے کے باعث رشک سے
ہمیں خوشامدی ٹٹو کہتے ہیں اور بعض حاسد تو بغض و حسد سے جل کر ہمارے
مُنھ پر بھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ تو ایک دم وہ ہیں۔ یعنی ایک نیک بخت،
بے ضرر، جفاکش، منکسر مزاج جانور کے اوصاف سے ہمیں متصف کرتے
ہیں۔ ایک آنریری مجسٹریٹ کی شان میں یہ گُستاخی سُن کر کبھی کبھی غصہ میں
ہمارا جی تو چاہتا ہے کہ اپنے ہی اجلاس میں ان پر توہین عدالت کا مقدمہ
دائر کر کے ان سب کو غلط گوئی کے الزام میں پھنسا دیں۔ کیوں کہ ہمارے
ملنے والے سب جانتے ہیں کہ ہم لاکھ سادہ لوح سہی مگر ایک دم وہ نہیں
ہیں۔ خیر ان رشک کرنے والوں کی باتوں کی ہمیں پروا نہیں۔ یہ کچھ بھی
کہیں مگر سمجھدار اور مہذّب لوگ اور خاص کر سرکاری طبقہ کی نگاہ میں
جو ہماری عزت ہے، اس کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ کوئی سرکاری
پارٹی یا حکام کی دعوت کا جلسہ ہو اس میں صرف کارڈ آنا کیا، بلکہ اکثر
اس کے انتظام کا فخر بھی ہمیں کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے شہر میں تو ہمارے پوزیشن سے ہر شخص واقف ہی ہے۔ لیکن شہر کے باہر، اس خیال سے کہ ناواقفیت کے باعث عوام کی طرح خاص لوگ ہمیں بھی معمولی درجہ کا آدمی نہ سمجھنے لگیں، کسی نہ کسی طرح اپنا تعارف کرا کے ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بار کلکتہ جاتے ہوئے جس ڈبہ میں ہم سفر کر رہے تھے، ایک جنٹلمین صاحب آکر ہمارے بغل میں بیٹھ گئے اور معمولی آدمی سمجھ کر ہم سے مخاطب تک نہ ہوئے۔ ہماری عادت ہے کہ جہاں کسی نئے شخص سے ملاقات ہوئی، صاحب سلامت کے بعد فوراً ان کا نام، مقام و ذریعۂ معاش پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کی حالت معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اس کے جواب میں اخلاقاً وہ بھی ہمارا نام اور پتہ اور ضروری حالات پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنی آنریری مجسٹریٹی سے واقف کرانے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے اسی مقررہ اصول کے مطابق ہم نے ان کا نام اور پتہ اور دیگر ضروری اور غیر ضروری حالات پوچھے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت فرسٹ کلاس کے ڈپٹی مجسٹریٹ اور گھر کے بھی خوش حال ہیں۔ جب وہ ہمارے سوالوں کے جواب میں اپنا پورا قصہ کہہ چکے تو اب ہم ان کے متوقع سوالوں کے جواب دینے کے لئے آمادہ ہو کر بیٹھے کہ جلد اپنی آنریری مجسٹریٹی سے ان کو واقف کرا دیں۔ مگر بجائے اس کے کہ

وہ ہمارا نام، پتہ اور دوسرے ضروری حالات از قسم آنریری مجسٹریٹی وغیرہ دریافت کریں، اس مردِ خدا نے اخبار بینی شروع کر دی اور اعزازی حالت تو کیا، ہمارا نام تک نہیں پوچھا۔ یہ بھی کوئی انسانیت اور شرافت ہوئی کہ ہمیں تو اپنے خاندان بھر کے حالات اور اپنی ڈپٹی مجسٹریٹی تک سے واقف کرا دیا اور ہماری آنریری مجسٹریٹی سے واقف ہونے کا موقع آیا تو اخبار بینی شروع کر دی۔ یہ کس قسم کی ذلیل بات ہے۔ وہ حضرت اخبار بینی میں مشغول اور ہمیں یہ الجھن کہ کس طرح اپنے پوزیشن کا اظہار کریں۔ دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انھیں تو ہم ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے دیکھیں اور ہم ان کے نزدیک ایک معمولی آدمی سمجھے جائیں۔ جس طرح سے ہو ہمارے پوزیشن سے ان کو واقف ہونا پڑے گا۔ یہ پختہ ارادہ کر کے ہم نے اس طرح کی گفتگو چھیڑی، جس میں ہماری آنریری مجسٹریٹی کا ذکر آنا لازمی تھا۔ ہم نے یہ پوچھا کہ جناب! آپ شہر میں آنریری مجسٹریٹوں کی کیا تعداد ہے؟ لیکن .... "ہمیں معلوم نہیں" کہہ کر انھوں نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ایسی ترکیب نکالی جس سے مجبوراً انھیں واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم نے کہا کہ مہربانی فرما کر آپ ہمیں اپنا ایڈریس عنایت فرمائیں اور ہم بھی اپنا نام اور پتہ لکھ کر جناب کو دیتے ہیں تا کہ کبھی کبھی ضرورت کے موقع پر خط و کتابت ہو سکے۔ انھوں نے بادلِ ناخواستہ

اپنا کارڈ دیا۔ ہم نے بھی ایک پرزہ پر فوراً اپنے نام کے ساتھ
موٹے حرفوں میں آنریری مجسٹریٹ لکھ کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔
مگر خدا سمجھے ایسے بداخلاق سے کہ نظر اخبار پر جمائے ہوئے نہایت
بے پروائی کے ساتھ اس پرزہ کو بغیر پڑھے یوں ہی اپنی جیب میں
ٹھونس لیا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ عجب بد دماغ سے
پالا پڑا۔ جب دیکھا کہ یہ وار بھی خالی گیا، برجستہ ہم نے کہا کہ
اس پرزہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے نام کے ساتھ صرف
آنریری مجسٹریٹ لکھ دینے سے بھی ہمیں خط مل جائے گا۔ اس پر
انھوں نے مسکرا کر کہا ماشاءاللہ آپ آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں؟
ہم نے کہا کہ محض خدا کی دین اور آپ لوگوں کی دعا کی برکت ہے۔
ورنہ ہیچمدان کس لائق ہے۔ دل میں کہا کہ یہ حضرت بڑے "ہچو من
دیگرے نیست" بنے بیٹھے تھے۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ دنیا میں کیا بلکہ
ریل ہی میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر عزت اور مرتبہ والے آدمی موجود
ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔

گورنمنٹ کی یہ بات اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ
داروغہ، انسپکٹر جیسے محدود اختیارات والے معمولی عہدہ داروں کو
تو ایک خاص امتیازی وضع کا لباس عنایت کرکے ان کی ممتاز
حیثیت کو پبلک میں نمایاں رکھتی ہے تو کیا ہم آنریری مجسٹریٹ ان
پولیس والوں سے بھی گئے گذرے ہیں کہ ایک ادنیٰ چپراسی اپنی

لال پگڑی سے لوگوں کو مرعوب کرتا رہے اور ایک آنریری مجسٹریٹ اپنے اونچے درجہ کا حاکم ہونے کے باوجود محض آنریری مجسٹریٹی کی کوئی خاص وردی نہ ہونے کے باعث کس مپرسی میں پڑا رہے۔ جس طرح گورنمنٹ نے ہم نیازمندوں کی عزت و آبرو بڑھانے کے لئے یہ آنریری مجسٹریٹی کی جگہ قائم کی ہے، اسی طرح ازراہِ عزت افزائی کوئی خاص وردی بھی بنوادیتی تو آئے دن جو ناواقف لوگوں پر موقع بے موقع ہم لوگوں کو اپنی آنریری مجسٹریٹی خود ظاہر کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، اس سے نجات مل جاتی۔ باقی رہا یہ سوال کہ وردی کی وضع کیا ہو؟ تو یہ سرکار کو اختیار ہے۔ چاہے ہائی کورٹ کے ججوں کے گون کی طرح ڈھیلا ڈھالا لبادہ ہو یا پولیس افسروں کی ہاف پینٹ کی طرح مختصر جانگھیا۔ جو کچھ بھی ہو مگر وردی ضرور ہو۔ اگر گورنمنٹ خرچ کے خیال سے اس تجویز کو نہیں قبول کرتی، تو جس طرح خطاب یافتہ حضرات اپنی گرہ سے نکال کر سرکاری خلعت حاصل کرتے ہیں، ہم لوگوں کو بھی اپنی وردی کے کپڑہ کی قیمت اور سلائی کی اُجرت اور بوتام وغیرہ کے دام سب جوڑ کر دینے میں عذر نہیں، بلکہ ہماری تو رائے ہے کہ ہر اُمیدوار آنریری مجسٹریٹی سے اس وردی کے دام پیشگی رکھوا لئے جائیں۔

مضمون چونکہ طویل ہوگیا ہے اور اس وقت اپنے پیشکار صاحب سے ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھوانا، بعض سفارشوں کی وجہ سے

ایک لکھے ہوئے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا اور ایک مقدمہ کے کارپرداز سے کچھ پرائیویٹ گفتگو کرنا ہے اور کچہری میں جانے کا وقت بھی قریب ہے، اس لئے اس لئے اس مضمون کو اس وقت ملتوی کر کے کسی دوسری تاریخ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

طنزیات ماپنوری

دوستی

موجودہ مغربی دور تہذیب میں جب وضع و لباس، تمدن و معاشرت، عقائد و خیالات، عادات و خصائل میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تو پھر بعض پرانے خیالات کے قدامت پرستوں کا دوستی کے قدیم رسم و رواج پر اب تک قائم رہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ دوستی کا یہ پرانا دستور کہ اگر ضرورت پڑے تو ایک دوست دوسرے دوست کے لئے جان و مال سب کچھ قربان کر دے، دوستی کا کس قدر خطرناک معیار ہے۔ خدا بھلا کرے آج کل کی مغربی معاشرت کا جس نے دوستی کے اس پرانے دستور اساسی کے کل دفعات بھی بدل دیئے۔ ریفارم اسکیم کی رو سے گو مکمل سیاسی آزادی نہیں ملی لیکن مغرب کی موجودہ معاشرتی اسکیم نے دوستی کی ان پرانی جکڑ بندیوں سے تو لوگوں کو آزاد کر دیا۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ جہاں پہلے تلاش کرنے پر بھی دوست نہیں ملتے تھے، اب خدا کے فضل سے دوستوں کی کثرت کا یہ حال ہے ان کا نام یاد رکھنا تو خیر بعض وقت دوستوں کی صورت پہچاننی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانہ میں برسوں کی تلاش و جستجو کے بعد کسی خوش قسمت کو

ایک دوست بھی مل گیا تو اس پر ہزاروں فخر و ناز کہ میرا ایک دوست ہے اور یہاں آج کل دوستوں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ جان چھڑانی مشکل۔
بات اصل یہ ہے کہ اگلے زمانے میں دنیا بھر کی چیزیں تو سستی تھیں مگر دوستی کی قیمت اس قدر زیادہ ادا کرنی پڑتی تھی کہ مال تو مال بعض وقت جان تک کی نوبت آجاتی تھی اور آج کل بفضلہ تعالیٰ زندگی کے لوازمات ہزار گراں سہی مگر دوستی کی یہ موجودہ ارزانی اگلوں کو کہاں نصیب کہ ایک پیالی چائے پلادی اور دوست بنالیا۔ ڈبے سے نکالا ایک پان پیش کیا اور یارانہ ہوگیا۔ ایک عدد سگریٹ بڑھادیا یا صرف دیا سلائی منھ کے پاس لے جاکر سگریٹ سلگادیا، دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ جہاں اتنے سستے داموں رستہ چلتے دوستی دستیاب ہوتی ہو، وہاں کس کی شامت آئی ہے کہ قدامت پرستوں کی طرح دوستی کے پیچھے اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگلے لوگوں نے دوستی کو ایسی مشکل اور ناقابل حصول شئے کیوں بنا دیا تھا؟ جس کے شرائط میں سے معمولی اور ادنیٰ شرط یہ بھی ہے کہ ایک دوست کی خوشی و غم میں دوسرے دوست کو شریک ہونا لازمی۔ دوست کی خوشی میں تو شرکت ایک ضروری چیز ہے، جس پر آج کل کے احباب نہایت ہی سختی سے عمل پیرا ہیں۔ مگر رنج و غم کے موقع پر کسی مصیبت زدہ دوست کے یہاں پہنچ کر اس کا غم تازہ کرکے خود کو اس آفت رسیدہ دوست کو پریشان کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اسی طرح دوستی کی یہ شرط بھی یقینی قدرے ترمیم طلب ہے، جس کی رو سے دوست کے مال کو اپنا اور اپنے مال کو دوست کا سمجھنا لازمی قرار دیا

گیا ہے۔ اس شرط کے پہلے حصّے سے کسی سمجھ دار آدمی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس زرین اصول پر آج کل کے یارانِ طریقت کار بند بھی ہیں۔ البتّہ اس کا دوسرا ٹکڑا یعنی اپنی چیز کو دوست کی چیز سمجھنا، یہ ذرا کچھ جھل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی چیز تو بہر حال اپنی ہے ہی۔ اس کے علاوہ دوستی کا یہ قدیم اصول بھی کس قدر عجیب و غریب ہے کہ دوست کی کمزوریوں اور اس کے عیوب کو منھ پر کہہ دینا دوست کا اولین فرض ہے۔ پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائیوں کا ذکر کرنا چونکہ موجودہ سوسائٹی کے نزدیک معیوب نہیں، اس لئے وہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن کسی کے عیب کو اس کے سامنے کہنا اول تو موجودہ تہذیب کی بنا پر ایٹی کیٹ کے خلاف ہے۔ دوسرے اگر ڈیفی میشن سوٹ ٹھونک دیا گیا تو حقِ دوستی ادا کرنے کے بدلے وکیلوں کا حقِ محنت ادا کرتے کرتے آپ کا دیوالہ نکل جائے گا۔ اس کے ساتھ قدیم دوستی کی ایک اور نئی شرط بھی سُن لیجئے۔ وہ یہ کہ ایک دوست کو دوسرے دوست کا مشیر اور رازدار ہونا بھی ضروری ہے اور یہ رازداری صرف عام معاملات ہی میں نہیں بلکہ دوست کی زندگی میں بھی اس کا مشیر اور ہمراز بن کر ہر طرح کی مدد سے اس کی اندرونی پریشانیوں کے دور کرنے کی کوشش کرے...... دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنا اسی کو کہتے ہیں۔ اس مہذب زمانے میں جبکہ دوست کیا، دوست کے باپ کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات اور اس کی پرائیوٹ باتوں میں دخل دے۔ دوستی کا مذکورۂ بالا اصول کس قدر خلاف تہذیب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

ان غیر ضروری باتوں کو دوستی کے فرائض میں داخل کرنے کی ضرورت اُس وقت اس لئے آپڑی تھی کہ اگلے زمانے کے لوگوں نے اس کا اندازہ کیا نہیں کہ آئندہ چل کر زمانہ جب ترقی کے انتہائی معراج پر پہنچ جائیگا تو دوستی کی کتنی نئی نئی قسمیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس پر کافی غور کئے بغیر اپنے ہی زمانے کے ماحول کے مطابق دوستی کا یہ محدود معیار قائم کر دیا کہ ؎

دوست آں دانم کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

اب آپ ہی کہئے کہ دوستی کی پرانی کسوٹی پہ آج کل کے احباب کو پرکھنے کا یہ نتیجہ ہوگا یا نہیں کہ سیکڑوں دوست اپنے ہاتھ سے نکل جائیں؟ دوستی جیسے وسیع المفہوم لفظ کو اس قدر محدود معنی میں مقید کرنا اگلوں کی سخت اصطلاحی غلطی تھی۔ انھیں چاہیئے تھا کہ دوستی کے مختلف اغراض و مقاصد اور اس کے برتنے کا جدا جدا موقع اور محل کا لحاظ کر کے دوستی کی جتنی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، سب کی جدا جدا قسمیں اور پھر ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات بیان کر کے دوستی کی ایک ایسی جامع تعریف کرتے جو کل اقسام دوستی پر صادق آتی۔

موجودہ زمانے میں دوستی کی جتنی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں سے چند کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) کلبی دوستی :- یہ خیال کر کے کہ حسب عادت کاتب نے غلطی کی یا مضمون نگار ہی ایسا کٹر پنجابی ہے کہ جسے بولنا تو در کنار "ق" لکھنا

تک نہیں آتا۔ آپ اس کلبی کو کہیں قلبی دوستی نہ سمجھ لیں۔ اس کو بھلا قلب اور دل سے کیا لگاؤ۔ محض چند گھنٹے تفریح، مذاق، ہنسی، دل لگی کے لئے کسی کلب کے ممبر آپس میں جو بے تکلفانہ مراسم پیدا کر لیتے ہیں، اسی کا نام کلبی دوستی ہے۔ جو صرف کلب کے احاطہ ہی تک محدود رہتی ہے۔ کلب سے باہر نکلے، کُل سامانِ تفریح کی طرح دوستی کو بھی وہیں چھوڑ آئے۔ اس کے بعد کسے را باکسے کارے نباشد۔ ما بخیر شما بسلامت کا اصول رہ جاتا ہے۔

(۲) سفری دوستی:۔ حالات سفر میں بہت سے عجیب و غریب غیر متوقع واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک سفری دوستی بھی ہے۔ جو بے شان و گمان اتفاقی طور پر دو اجنبیوں کے لئے تھوڑی دیر تک سامان دل چسپی بن جاتی ہے، جس کی ابتدا تو دریافت نام سے ہوتی ہے، پھر سکونت، پیشہ، مالی حیثیت کی تفتیش سے بڑھتے بڑھتے تعداد اولاد و دیگر خانگی امور کی باز پرس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اِدھر سے پان اُدھر سے سگریٹ، اِدھر سے چائے اُدھر سے ناشتہ کا تبادلہ بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد خط لکھنے اور دوبارہ ملاقات کے قیمتی وعدے پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ غرض سفر کی منزل ختم ہونے کے پہلے چند ہی گھنٹوں میں دوستی کے کُل مراحل طے کر لئے جاتے ہیں۔ پھر یہ ساری دوستانہ گرم جوشیاں ریل کے ڈبے سے باہر نکلتے ہی مسافروں کی بھیڑ میں ایسی غائب ہو جاتی ہیں کہ پھر کچھ دنوں کے بعد اگر کہیں

دونوں میں اتفاقی مڈبھیڑ ہوگئی تو دیر تک ایک دوسرے کو تکتے رہنے کے بعد سلسلۂ گفتگو از سر نو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

ایک:۔ اس کے پہلے بھی آپ سے کہیں نیاز حاصل ہے۔

دوسرا:۔ مجھے بھی یاد آتا ہے کہ کہیں آپ کو دیکھا ہے۔

یہ ہے سفری دوستی جس سے اگلوں کو شاید ہی کبھی واسطہ پڑا ہو۔

(۳) اخلاقی دوستی:۔ اخلاق اور خاص کر نمائشی اخلاق عجیب فریب دہ چیز ہے۔ جس کسی کے ساتھ آپ اسے برتیں وہ غریب خواہ مخواہ دوستی کے مغالطہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ آج کل کے بڑے لوگوں میں خلوص و محبت تو ہوتی نہیں، لے دے کر ان کے پاس صرف ظاہری اخلاق ہے، جسے ابتدا میں تو ضرورتاً اور پھر عادتاً برتتے پر وہ مجبور ہیں۔ اور یہ بہت سے ناواقفوں کے لئے مصیبت کا سامان بن جاتا ہے۔ اکثر نا تجربہ کار بڑے آدمی کے دوست ہو جانے کے وہم میں مبتلا ہو کر بہت سی امیدیں ان کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں، جو کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتی۔ سچ پوچھئے تو اس میں صاحبِ اخلاق کا کوئی قصور نہیں۔ اس طرح کے نمائشی اخلاق بڑے لوگوں سے عادتاً سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ اب کوئی اسے دوستانہ برتاؤ سمجھ کر غلط توقعات قائم کر لے تو اس پر کیا الزام؟ دوسروں کو کیا کہا جائے، خود مجھے ایک جج صاحب کے بے تکلفانہ برتاؤ نے ان کی دوستی کے مغالطہ میں ڈال دیا تھا اور اسی دوستی کے زعم میں ایک کام کی فرمائش بھی میں نے ان سے کر دی۔ گو یہ ایک محض معمولی کام تھا اور

انھوں نے نہایت فراخ دلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ اس کے پورا کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ ساتھ ہی یقین دلانے کے لئے یہ بھی کہا کہ دوست کے کام کو میں اپنا کام سمجھتا ہوں۔ مگر بد قسمتی سے نکلی وہ اخلاقی دوستی جس کو دلی خلوص سے کچھ لگاؤ ہی نہ ہوتا۔ اب اگر متنازر یاد دہانیوں کے باوجود اسے پورا نہ کر سکے تو اس میں ان کا کیا قصور؟ قابل شکایت بات تو اس وقت ہوتی جب صحیح معنوں میں واقعی دوستانہ تعلقات ہوتے ....
کسی کو اس کی ظاہری خوش اخلاقی پر اپنی خوش خیالی سے کوئی اپنا دوست سمجھ لے تو یہ سمجھنے والے کا قصور ہے نہ کہ اس اخلاق برتنے والے کا۔

(۴) کاروباری دوستی:— اصلی اور کاروباری دوستی میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ وہی آمد و رفت، وہی دوستانہ تعلقات، وہی خلوص و محبت کی باتیں، وہی بے تکلفانہ برتاؤ۔ غرض دوستی کے جتنے لوازمات ہیں، ایک ایک کر کے سب اس میں موجود۔ البتہ روپے پیسے کا معاملہ جب آ جاتا ہے، تو اس وقت عارضی طور پر یہ دوستانہ مراسم نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسا موقع ہر وقت اور ہر شخص کے ساتھ پیش تو آتا نہیں، اس لئے جس کو ایسے دوستوں سے سابقہ پڑا ہے اس کے سوا دوسرا اس فرق کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی اپنے ایک کاروباری دوست کے دوستانہ تعلقات سے مستفیض ہونے کا موقع مل چکا ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں۔

قصّہ یوں ہے کہ ایک ڈگری کی ادائیگی کے لئے مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت آپڑی۔ مختلف جگہوں میں کوشش کے باوجود اتفاق سے اس کا سامان نہ ہوسکا اور ادائیگی کی مدّت میں صرف ایک روز باقی رہ گیا۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر گھبرایا ہوا ایک ایسے بے تکلف دوست کے پاس پہنچا، جو خوش حال زمیندار ہونے کے علاوہ مہاجنی کاروبار بھی کرتے تھے۔ مجھے پریشان صورت دیکھ کر نہایت ہی تپاک کے ساتھ انھوں نے خیریت پوچھی۔ میں نے اپنے آنے کی غرض اور اس فوری ضرورت کو بیان کرتے ہوئے کہا "اور روپئے میرے پاس ہیں، صرف ڈیڑھ دو ہزار ملنے سے میرا کام چل جائے گا اور وہ بھی فقط دو ہفتہ کے لئے، بلکہ اس کے اندر ہی موضع سے روپئے آنے کے ساتھ ہی واپس کر دوں گا۔ چونکہ کل تک ڈگری کی پوری رقم داخل نہ کرنے سے جائداد کے نیلام ہوجانیکا خطرہ ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ تم سے دستگرداں لے کر کام نکال لوں۔ انشاء اللہ ہفتہ کے اندر ہی واپس کر دوں گا۔"

پہلے تو انھوں نے میری کل باتیں غور سے سُنیں۔ جب ضرورت کی اہمیت کا انھیں پورا اندازہ ہوگیا تو دوستانہ بے تکلفی نے کاروباری متانت کی صورت اختیار کرلی اور بغیر جھجک کے نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ کہا "بھئی دوستوں کے ساتھ مہاجنی کاروبار سے حتی الامکان میں احتیاط برتتا ہوں۔"

میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "یہاں پر مہاجنی کاروبار کا کیا ذکر۔

ہیں تو صرف آٹھ دس روز کے لئے ایک دوست کی حیثیت سے دستگرداں مانگتا ہوں۔"

چند منٹ تک سوچنے کے بعد انھوں نے کہا "دستگرداں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ باقی رہا قرض۔ تو تم جانتے ہی ہو کہ آج کل کوئی مہاجن سیکڑے دس روپئے نذرانہ اور تین روپئے ماہانہ سود سے اِدھر بات ہی کرنا نہیں چاہتا اور خاص کر ہینڈ نوٹ پر دینے کے لئے شاید ہی کوئی راضی ہو اور کابلیوں کو تو پوچھئے ہی مت۔ وہ تو اور بھی سیکڑے دس بارہ روپئے سے کم پر روپئے لگاتے ہی نہیں۔ اب اگر تمھارے کام نکالنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو چونکہ دوستی کا واسطہ ہے اس لئے معاملہ کی صفائی کے لئے نذرانہ اور سود پہلے طے ہو جانا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "ایسی ضرورت کے موقع پر دوستانہ تعلقات کے باوجود اس طرح مہاجنی برتاؤ کہاں تک ایک دوست کے لئے مناسب ہے؟"

اس کا جواب جو انھوں نے دیا وہ واقعی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہا "میرے تمھارے جو دوستانہ مراسم ہیں، وہ اپنی جگہ پر ہیں اور یہ ہے معاملہ بزنس کا۔ دوستی، دوستی ہے۔ بزنس، بزنس ہے۔"

میں ان کے کاروباری انداز گفتگو اور اپنی ضرورت پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے شرائط میں اس وقت اگر کچھ بھی عذر کیا تو

دوستی بزنس کی نذر ہو ہی چکی، کہیں یہ ضروری بزنس بھی دوستی کی نذر ہو کر نہ رہ جائے۔ مجبوراً دوستانہ مراسم کو ہاجنی تعلقات میں منتقل کر کے ان کی مطلوبہ شرائط کے ساتھ ہینڈ نوٹ پر بلا جبر و اکراہ و بلا تحریص و ترغیب و بغیر بہکانے وبھسلانے و دباؤ ناجائز کے بدرستگئ ہوش و حواس دستخط کر دیا اور نذرانہ کی رقم مع سود پیشگی شکریہ کے ساتھ حوالہ کرنے کے بعد بقیہ لئے ہوئے ہر چہ از دوست می رسد نیکوست کہتا ہوا اپنے گھر واپس پہنچا۔ سود کے ساتھ پیشگی شکریہ ادا کرنا بھی اس لئے ضرور تھا کہ سود در سود و تاوان و خسارہ کی رقم بھی اگر وہ پہلے ہی رکھوا لیتے تو میں کر ہی کیا لیتا۔ یہ ایک دوست کا ایسا احسان تھا کہ جس کے بوجھ سے اس کے سامنے ہمیشہ میری گردن اگر جھکی نہیں تو ٹیڑھی ضرور رہے گی۔

(۵) استحفاظی دوستی :۔ دوستی کی اور جتنی قسمیں ہیں، روابط اور تعلقات کے اعتبار سے تو نہیں مگر اغراض و مقاصد کے لحاظ سے، ان سب سے یہ جداگانہ قسم کی دوستی ہے۔ اس کی بنیاد دوست سے بھلائی کی امید پر نہیں بلکہ "مرا زخیر تو امید نیست" کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فتنہ پرداز دوست کی شرارت اور فساد سے بچنے کے لئے دوستانہ روابط پیدا کئے جاتے ہیں۔ سرحد کے آزاد قبائل کے ساتھ گورنمنٹ کے دوستانہ تعلقات یا پولیس والوں سے بعض لوگوں کے دوستانہ مراسم اس کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۶) سیاسی دوستی :- یہ دوستی اپنے گوناگوں مقاصد کے اعتبار سے اس قدر پیچیدہ ہوتی ہے کہ عوام تو عوام بہت سے پڑھے لکھے دو سیاسی دوستوں کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کہ آپس میں یہ دونوں دوست ہیں یا دشمن - دوسروں کو چھوڑیئے، میں تو کہتا ہوں خود ان دونوں دوستوں کو بعض وقت یہ فیصلہ کرنے میں دقت پڑتی ہے کہ ہم دونوں کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں یا معاندانہ - اس دوستی میں پہلی شرط یہ ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی کسی بات پر اعتبار اور بھروسہ نہ کرے -چونکہ قدیم زمانے کی دوستی کی اندھی تقلید سیاسی دوستی میں تو ہوتی نہیں کہ ایک بار جس کا ساتھ دیا تو عمر بھر اسی کے ہو رہے - بلکہ احوال و مواقع و مصالح کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، اس لئے اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے کہ ایک معمولی سی لغزش سے بھی دوستی تو دوستی خود اپنی ہستی خطرہ میں پڑ جاتی ہے - سیاسی دوستی کی زبان اور اس کی اصطلاح بھی عام سمجھ سے بہت بلند ہوتی ہے، جسے سیاست دانوں کے سوا نہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے، نہ صحیح طور سے استعمال کر سکتا ہے - ایسی دوستیاں مصلحتاً اور ضرورتاً زیادہ تر سلطنتیں آپس میں کرتی ہیں - اس سیاسی دوستی کی بھی کئی قسمیں ہیں :-

(الف) میعادی دوستی :- اگر قوت و اقتدار میں ایک دوست اپنے دوسرے دوست کا ہم پلّہ ہے تو دونوں قوی دوستوں کا رشتۂ دوستی

اس قدر نازک اور کمزور ہوتا ہے کہ دوستانہ کشمکش کے ایک ہی جھٹکے میں ہر وقت اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے، اس لئے کسی خاص معاہدہ کے ماتحت "میعادی دوستی" قائم کرنی پڑتی ہے، جس میں مقررہ مدت کے لئے باضابطہ دستخطی عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ گو اس تحریری اقرارنامہ کی پابندی دونوں دوستوں کے لئے چنداں ضروری نہیں، مگر اس کی خلاف ورزی پر پروٹسٹ کے بعد اس کی تاویل کرنی عہد شکن دوست کے لئے لازمی ہے اور اس عذر گناہ بدتر از گناہ کو مصلحتاً دوسرے دوست کے لئے تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(ب) وقتی دوستی :- اس کا دار و مدار وقتی مصلحت پر ہے۔ پہلا اصول اس کا موقع اور ضرورت ہے۔ وعدہ کا ایفا اور معاہدے کی پابندی گو اس میں بھی ضروری نہیں لیکن اس کے باوجود بعض اوقات یہ وقتی دوستی گلے میں ہڈی بن کر ایسی پھنس جاتی ہے کہ نہ نگلتے ہی بنتی نہ اُگلتے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وقتی ضرورت سے مجبور ہو کر دو متضاد دوستیاں بیک وقت کرنی پڑتی ہیں۔ دو ایسی جماعت جو اپنے اپنے مختلف مقاصد و اغراض کے باعث ایک دوسرے کی دشمن ہوں۔ ان دونوں دشمنوں سے بیک وقت دوستانہ تعلقات قائم رکھنا جس قدر مشکل ہے، اسے وہی خوب سمجھ سکتا ہے جس غریب کو دوستی کی ان دو کشتیوں میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ایک سے اظہار ہمدردی کیا تو دوسرے کا تیور بدلا اور دوسرے کی حمایت کی تو پہلے نے وعدہ یاد دلا کر ڈانٹ ڈپٹ بتائی۔ اب آدمی کس کا ساتھ دے کس کا نہیں۔ یہودیوں اور فلسطین کے عربوں سے

جس ضرورت کی بنا پر وقتی دوستی کرنی پڑی تھی وہ پوری ہو جانے کے بعد اب آپ ہی کہئے کہ ان دو متضاد دوستیوں کا نباہنا کس قدر مشکل کام ہے۔ مجبوراً اس دوستانہ کشمکش سے نجات پانے کی اس کے سوا اور کیا صورت ہو سکتی تھی کہ یا تو ان دونوں کو آپس میں نپٹ لینے کے لئے چھوڑ دیا جائے یا کسی ایسے کا ساتھ دیا جائے جس سے آئندہ کی اور دوسری امیدیں وابستہ ہوں۔ باقی رہا وعدے اور معاہدے کی پابندی تو جب عام سیاسی دوستی میں یہ غیر ضروری شئے قرار دی جا چکی ہے، تو ایسی دوستی میں جس کا نام ہی وقتی دوستی ہے کہاں تک لازمی سمجھی جا سکتی ہے۔

(ج) حمایتی دوستی:۔ اس دوستی میں البتہ ہر طرح کی اعانت و مدد دوست کا لازمی فرض ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے کسی اور سے دشمنی پیدا ہونے کا احتمال نہ ہو۔ بعض ہی خواہ و ہمدرد دوست کسی مصلحت سے اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے دوست کی اعانت کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت یہ دوستانہ امداد عملی صورت سے منتقل ہو کر صرف زبانی رہ جاتی ہے۔ یوں کوئی کچھ کہے مگر مصیبت میں زبانی ہمدردی سے ہمت بڑھاتے رہنا بھی معمولی مدد نہیں۔ اب اگر حبش والے اپنے کسی حمایتی دوست کو یہ کہہ کر بدنام کریں کہ ہر طرح کی حمایت کا وعدہ کر کے حوصلہ بڑھا بڑھا کر پہلے تو ہمیں اٹلی سے بھڑا دیا، پھر عین وقت پر یہ تسلی دے کر کہ "چڑھ جا بیٹے سولی پہ رام بھلا کرے گا" کنارہ کش ہو گئے۔ اب آپ ہی فرمائیں ان کا یہ الزام کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ ان ناعاقبت اندیشوں سے کوئی یہ

پوچھے کہ حمایتی دوست کے لئے کس کتاب میں لکھا ہے کہ ایسے موقع پر خواہ مخواہ کسی دوسرے سے دشمنی مول لے کر اپنے بھرم کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

(د) جبری دوستی :۔ جب کوئی چھوٹی اور کمزور حکومت کسی بڑی سلطنت کی نظر عنایت کا مرکز بن جاتی ہے، تو بڑی سلطنت کی دوستانہ ہمدردی "مان نہ مان میں تیرا مہمان" بن کر کمزور کے گلے میں دوستی کا طوق زبردستی ڈال دیتی ہے۔ اب یہ غریب لاکھ چیخے چلائے کہ "بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی جیئے گا" مگر صورتاً یہ گربۂ مسکین دوست اس کی جان کب چھوڑتا ہے۔ خواہ مخواہ اس کا سر پرست دوست بن کر اس کی بہت سی ذمّہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ پھر یہ دوستانہ تعلقات بڑھتے بڑھتے "من تو شدم" تو نہیں مگر "تو من شدی" کی صورت اس لئے اختیار کر لیتے ہیں کہ "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

سیاسی دوستی کی مذکورۂ بالا چند مثالوں سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس قسم کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں صرف یورپ ہی والے ماہر ہیں بلکہ مغربی سیاست کے فیض برکت سے ایسی دوستیوں کا رواج ہندوستان میں بھی خدا کے فضل سے ہو چلا ہے۔ یورپ کے مدبّر جن کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ہوتی ہے وہ اگر کامیابی کے ساتھ ایسی دوستیاں نباہ سکتے ہیں، تو بفضلہٖ تعالیٰ یہاں کے لیڈر بھی جن کے ہاتھ میں قوم کی نکیل ہے، کسی بات میں ان سے ہیٹے نہیں۔ وقتی ضرورت کی بنا پر یہودیوں اور فلسطین کے عربوں کے ساتھ بیک وقت دو متضاد دوستیاں کی گئیں اور جس طرح اب اس کی نباہ

کی جا رہی ہے، بعینہ یہاں بھی وہی جبری دوستی کی کوشش کی جا رہی ہے۔
اب آپ ہی انصاف فرمائیں، موجودہ زمانے میں جب کہ دوستی کی اتنی نئی
نئی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں، قدیم زمانے کے دوستوں کی طرح آج کل کے احباب
سے بھی اسی طرح عملی ہمدردی کی امید رکھنا کس قدر فرسودہ خیال ہے۔ باقی
رہی زبانی ہمدردی تو بیچارے اگلے زمانے والوں کے پاس اس کے اظہار
کے لئے الفاظ کا اتنا ذخیرہ کہاں تھا جو آج کل کے احباب ایسے موقع پر
استعمال کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مصیبت کے موقع پر میرے دوستوں
نے ہمدردی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس مصیبت کے دور ہو جانے کے بعد
اس کا اثر اب تک میرے دل پر ہے۔

کئی سال ہوئے کہ چند احباب کے مشورہ سے میں نے غلّہ کی
تجارت شروع کی۔ اب اسے میری بدقسمتی کہئے یا ناتجربہ کاری کہ یکایک
بازار گر جانے کی وجہ سے ایک ہی سال کے اندر جو کچھ رہی سہی پونجی تھی وہ
تو غائب ہی ہو گئی، مہاجن اور آڑھت والے کا بقایا جو میرے ذمّہ
رہ گیا وہ جدا نفع میں۔ اس ناقابل برداشت مالی نقصان نے جیسی میری
قابل رحم حالت بنا دی اُسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میری اس مصیبت کا
حال سُن کر روزانہ ملنے والے احباب میں سے بعضوں نے تو غالباً اس
وجہ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا کہ غایت محبت کے باعث شاید میری پریشانی
ان سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ بعض دوستوں نے آ کر جس طرح حق دوستی
ادا کرنا شروع کیا وہ موجودہ دوستی کی بہترین مثال ہے۔

ایک مہربان :— یہ غلّے کے کاروبار میں تمہیں گھاٹا کیسے ہوا؟

میں :— تجارت میں عموماً جس طرح گھاٹا ہوتا ہے، بس ویسے ہی سمجھئے۔

دوسرے کرم فرما :— آخر یہ تجارت کی تھیں کیا سوجھی تھی؟

میں :— چونکہ بدقسمتی سے چوری کرنا یا جیب تراشنا مجھے آتا ہی نہیں، اس لئے مجبوراً تجارت ہی کرنی شروع کر دی۔

تیسرے بہی خواہ :— اگر تجارت ہی کرنی تھی تو یہ کیا ضرور تھا کہ غلّہ ہی کی ہو، جس میں کوئی تجربہ تھیں نہیں۔ بعض تجارتیں ایسی نفع بخش ہیں، جن کی بدولت آدمی تھوڑے ہی دنوں میں مالا مال ہو جائے۔

میں :— جی ہاں۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ افیون یا کوکین کی خفیہ تجارت شروع کر دوں، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ غلّہ کے کام سے بھی زیادہ اس میں ناتجربہ کار تھا۔

چوتھے دوست :— افسوس! یہ بیٹھے بٹھائے تم نے مفت مصیبت مول لے لی۔

میں :— بیٹھے بٹھائے تو نہ کہنا چاہیے۔ اس تجارت میں مجھے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی اور آپ کو مفت مصیبت لینے پر جو افسوس ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اتنی کثیر رقم صرف ہونے کے باوجود مفت مول لینے کا مجھ پر غلط اتہام ہے۔

پانچویں شفیق حال :۔ تمھاری اس مصیبت سے مجھے دلی صدمہ پہنچا، مگر اپنے کئے کا کیا علاج ؟

میں :۔ معاف کیجئے گا، غلطی ہوئی۔ انشاء اللہ آئندہ کبھی ایسی گستاخانہ حرکت اس خاکسار سے سرزد نہ ہوگی جس سے آپ کو دلی صدمہ پہنچے۔

چھٹے ہمدرد :۔ جس کام سے آدمی کو واقفیت نہ ہو، اس میں بے سمجھے بوجھے کود پڑنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ اتنی کثیر رقم کا خسارہ خود اپنی حماقت کا نتیجہ ہے۔

غرض جو آیا، غم گسار دوست کے بدلے ناصح مشفق ہی بن کر آیا۔ میں بھی کُڑھ کر ان کی تکلیف دہ اور بے محل باتوں کا اسی طرح اول فول جواب دیتا رہا۔ ایک تو نقصان مایہ اُس پر شماتت ہمسایہ نے میرے زخم خوردہ دل پر اور بھی نمک پاشی کی۔ ایسی مصیبت کے وقت میں ان ناصحانہ زبانی ہمدردیوں نے مرہم کی بجائے نمک بر جراحت ہوکر میرے زخموں کو اور ہرا کر دیا۔ اس وقت بے ساختہ میری زبان پر یہ مصرعہ آگیا۔ ع

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

جی چاہتا تھا کہ اگر چارہ ساز نہیں تو کم سے کم صرف غم گسار ہی کوئی ایسا ہوتا جس کے پاس اپنی دُکھ بھری کہانی دل کھول کر کہتا اور اس داستان غم کا اثر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے محسوس

ہوتا کہ کسی نے میری آدھی مصیبت بانٹ لی ہے۔ مگر ایسے مخلص ہمدرد اب کہاں؟ زمانہ ہوا۔ دنیا ان سے خالی ہو گئی۔ اب تو ویسے ہی دوست رہ گئے ہیں، جن پر یہ مصرع صحیح طور پر صادق آتا ہے۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مطائبات مانپوری

علم الحیوانات کے پروفیسر سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کُتّوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے، مینگنیاں بھی۔ یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتنا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے ۷ بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے ۶ بجے تک بھونکتے چلے گئے، تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی ۱۱ بجے جو ایک کُتّے کی طبیعت ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلہ میں سے ایک کُتّے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصّہ آیا، ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال و مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کُتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت

بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر، آرڈر پکارا لیکن ایسے موقع پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے؟

پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست واقع ہوئے ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے، ان کا ذکر ہی جانے دیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں ہی کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پر تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، گلے بازی کئے جاتے ہیں۔

گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے کہ ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیاگرہ سے منھ موڑا ہو۔ شاید آپ اسے تعلّی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت ہاتھ میں لاٹھی، چھڑی ضرور رکھنی چاہیئے کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اگر ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔

شاید اس وقت آپ یہ بھی اندازہ لگالیں گے کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سُروں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔ بعض اوقات ایسا اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نو مشقی کا عالم بھی ہے، اسی لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مُڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصوّر ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کُتا دیکھا۔ ایک تو کُتا اور پھر بکری کی جسامت کا — یہ گویا بہت ہی بڑا کُتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے، چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی معقول زاویہ پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال ہے کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی تھی۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں، اس لئے آج تک کُتّے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کُتّے نے آج تک ہم کو کبھی بھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کے بجائے ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ اس کُتّے کی مٹی سے بھی کُتا گھاس پیدا ہو۔ لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کُتّے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں، سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدّی مرض ہے اور پھر بچّوں اور بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں گے کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیئے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں۔ چلتی موٹر کے سامنے، گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہے تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں گے۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جاں بخشی تھوڑا ہی کر دے گا؟ کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جتھا باہر آ کر تبلیغ کا کام شروع کرے تو آپ ہی کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجّہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات اُن کی، سکنات ہماری)۔ اس ہنگامے میں دماغ

بھلا خاک کام کر سکتا ہے ؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا ؟ بہر صورت کتوں کی یہ پہلے درجے کی نا انصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے ۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب! سڑک بند ہے ۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا کئے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں ۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ اور متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے ۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے ۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں) خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں ۔ کتے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا ۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے ، گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا ۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے ۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے ۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا ، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا ، لوگوں سے کہلوایا ، خود دس بارہ آوازیں دیں ، تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ و مخمور آنکھوں کو کھولا ، صورت حالات کو

ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا، تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز جا کر پرے لیٹ گئے، اور خیالات کے سلسلے کو، جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا، پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک تیلی سی دُم کو تا بحدِّ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انھوں نے غیض و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ بچّہ فقیروں کو چھیڑتا ہے، نظر نہیں آتا؟ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتا ہے۔ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے رہتے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔ اگر خدا مجھے کچھ عرصہ کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے، رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں گے۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے، جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے:۔

"بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"!

یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کردے اور کاٹنا شروع کردے۔

مضامین پطرس

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے "لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔"

وہ حضرت بھی (معلوم ہوتا ہے) نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکّہ بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے، ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرہ کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا، تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا، میرے آباء و اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔

.بہتیرا آواز میں دیتا ہوں ...." اچھا! اچھا! ....

تھینک یو! .... جاگ گیا ہوں .... بہت اچھا! ....

نوازش ہے! ...." آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں ۔ خدایا یہ کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردہ کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰؑ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے ۔ زندہ ہوگیا تو ہوگیا ۔ نہیں تو چھوڑ دیا ۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازہ کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس سے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ تو اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں ۔ آخر کار جیب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھا ۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں، تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں ۔ سوچا کہ آج پتہ چلائیں گے کہ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے ۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سُنی تھیں، ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو ۔

کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی ۔ "لالہ جی! ...... لالہ جی!" جواب آیا "ہوں" میں نے کہا آج کیا بات ہے ۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا

ہے ؟" کہنے لگے " تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے ؟"

تین بجے کا نام سُن کر ہوش گُم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا " کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں ؟"

کہنے لگے " تین .... تو نہیں .... کچھ سات .... ساڑھے سات .... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا ارے کم بخت خدائی فوجدار بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا ؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے ؟ ہمیں تو نے ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے ؟ تین بجے ہم اُٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے ؟ ابے احمق کہیں کے۔ تین بجے اُٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں ؟ امیر زادے ہیں، کوئی مذاق ہے ؟ لاحول ولاقوۃ۔

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے ؟ ہمیں اپنے کام سے غرض ہے۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اُٹھے۔ بارہ بجے منھ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک پر نکل گئے۔

شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی

اس پر شام کا رومان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی - ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے - ع

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر! ......" ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے کہ بس انگلیاں وہیں پر رُک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے - ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر) میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں - خیر فرمایئے" - بولے — "ذرا .... وہ میں .... میں ڈسٹرب .... ہوتا ہوں"

بس صاحب ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی، فوراً مر گئی - دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے - دانت بھینچ لئے - نکٹائی کھول دی - آستینیں چڑھالیں - لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ سامنے سرخ، زرد، سبز سبھی کتابوں کا انبار لگا تھا - اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ سب کتابوں کو ترتیب سے

میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔ بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے موافق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ را پریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح ۳ ہی بجے کیوں نہ اُٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبعی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کیا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا لغویات سے ہے۔ البتہ ۵، ۶، ۷ کے قریب نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اُٹھنا ہو تو جلد ہی سونا چاہیئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے، بستر میں داخل ہو گئے۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں۔ یوں ہماری قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا۔ بس ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ جھنجلا کے درخواست کی "لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے یعنی

جس وقت ۶ بجیں ...." جواب ندارد۔ میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکے تو......... سُنا آپ نے ؟"..... چُپ ....

"لالہ جی! ...."

کڑکتی ہوئی آواز میں جواب دیا " سُن لیا۔ سُن لیا....... چھ بجے جگا دوں گا۔ بھتری گا ملیں فورا بلفا ملیں........"

ہم نے کہا " ب، ب، بہت اچھا یہ بات ہے "

توبہ، خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔ لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدہ کے مطابق دوسرے دن صبح ۶ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں تو ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس شکل میں اسے قبول کیا۔ گولہ باری بند کر دی۔ اس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچہ کی طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی، پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اُتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ شاید کھانسا کہ خدا جانے خرّاٹا لیا۔ خیر، یہ تو یقینی

امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے، نہ آپ ماہر ہیں اور نہ میں۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو، اس دن ۶ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کام میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہہ رہا کہ قصور اپنا ہی کچھ معلوم ہوتا ہے۔

جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کیں اور ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ "لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف رہتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی یہ خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ پوچھنے لگے۔ "تو میں آپ کو ۶ بجے جگا دیا کروں گا نا۔" میں نے کہا "ہاں! واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شک۔" شام کے وقت آنے والی صبح کے

مطالعہ کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر جوڑ دیں، کرسی چارپائی کے قریب سرکا لیا اور کوٹ اور گلوبند کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کن ٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی کو تکیہ کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔ صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کہا اور نہایت بے دردانہ لہجہ میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا — دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔ دل نے کہا۔ اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔

بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔ ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور

پھر سوچنے لگے .... خوب .... تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر ہے نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی ......
(لحاف کانوں پر سرک آیا) .... تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں .... بہت ہی پہلے .... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے .... کیا بات ہے! خداوندانِ کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج ۷ بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے .... (لحاف سر پر) .... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے .... (آنکھیں بند) .... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں؟ شیکسپیئر یا ورڈسورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہو گا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ کی یاد سے بہتر چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک

فلسفہ نہیں .... ورڈسورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے .... لیکن شکسپیئر .... نہیں ورڈسورتھ ہی ٹھیک رہے گا .... شکسپیئر .... ہملیٹ .... لیکن ورڈسورتھ .... لیڈی میکبتھ .... دیوانگی .... سبزہ زار .... سنیچر سنیچر .... یاد بہاری .... صید ہوس .... کشمیر .... میں آفت کا پرکالا ہوں ....!

یہ معمہ اب فلسفہ مابعد الطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈسورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے، اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔ کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آواز دی تھی۔ آپ نے آواز نہ دی" ہیں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہ اوہ، لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں پہلے ہی سے جاگ رہا تھا" بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں .... اس کے بعد .... کوئی سات بجے کے قریب آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے نہیں ...."

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا، گویا وہ پاگل ہوگئے تھے اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہوگئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس عمق میں رہے۔ پھر یکا یک اگ

محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے، میں اس وقت.......... اے .... اے نماز پڑھ رہا تھا" لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے اور ہم زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچا کئے کمرے میں چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روزمرّہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ۱ ۶ بجے، جاگنا ۱۰ بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔ جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرق ناز محو بالش کم خواب اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہو، گا رہی ہو" تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوش گوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو، آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے ــــ نصیب یہ ہے کہ پہلے "مسٹر! مسٹر!" کی آواز اور دروازے کی دنا دن سلما نوازی کرتی ہے اور پھر چالیس گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ

کے ریشہ ریشہ میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑیوں کی گڑبڑنے .... پھر دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازے کے بند ہونے، کتابوں کے پھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، گلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا قبل البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے ؎

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

مضامین پطرس

مشینوں کی موت

ایک دو روز پہلے خفیف سا چرچا تھا کہ سارے ہندوستان میں بجلی کے کارخانے خراب ہو رہے ہیں۔ برقی طاقت پوری طرح کام نہیں کرتی۔ آخر جمعہ کو یہ بات اخباروں میں چھپ گئی کہ ملک بھر میں کوئی نرالا برقی تلاطم ہے کہ برقی رو پیدا ہوتی ہے مگر کام نہیں کرتی۔ ہفتہ سے کسی شخص کو کوئی تار کہیں سے نہ آیا۔ سرکاری بے تار کے برقی پیغام البتہ موصول ہو رہے تھے مگر ان کا راز کسی پر نہ کھلا۔ اسی دن بہشت سے ہوائی جہاز کسی غیر معلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے اور ریلوں میں بہت سی انگریزی فوجیں بھی کسی طرف نکل گئیں۔

اتوار لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ گو دِلکتہ جیسے بڑے شہر میں تاروں کا نہ آنا سخت اضطراب انگیز ضرور تھا۔ صبح پیر کو ایک بے تار برقی پیغام آیا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ایک روز تک سارے ملک کی مشینیں خراب ہو جائیں گی اور اس پیغام کو آخری پیغام سمجھنا۔ دِلکتے میں پیر کا دن عجب شورش میں گزرا۔ جن دفاتر، دکانوں اور کارخانوں میں انگریز افسر ہوتے، وہاں کوئی انگریز نہ تھا۔ کلرک، چپراسی، مزدور سب بلا کام کئے واپس آ گئے۔

اس کے بعد کی ڈائری حسب ذیل ہے :-

(پیرہ بجے شام) :- سارے شہر میں عجب شاندار جلسے ہوئے۔ بھارت ماتا کی از سرِ نو تابندگی کس قدر شاندار ہے۔

سری جت متر چندر داس، پنڈت چھتری مہاراشٹر، راجہ نرمل بھگت نے وہ تقریریں کیں کہ ساری عمر میں ان لوگوں نے پبلک کے دل میں اپنی اسقدر محبت پیدا نہ کی ہوگی، جو آج کی تقریروں سے کی۔ داس صاحب نے کہا کہ پرماتما کرے کہ یہ جھوٹ "کہ مشینیں بیکار ہو جائیں گی" سچ ہو جائے۔ کیا سری حضور رامچندر جی موٹروں میں سوار ہوتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ ان کی روحانی شکتی البتہ ضرور اس پایہ کی تھی کہ وہ جہاں چاہتے بغیر مشینوں کی مدد کے جا سکتے تھے۔ مگر اُنھوں نے اپنے پیارے پوتر ملک کے لیے مشینوں کا رائج ہونا پسند نہ کیا۔ جو لوگ ہندوستان اور لنکا کے درمیان پُل بنا سکتے تھے کیا ان کے لئے ریلیں اور موٹریں ناممکن تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے مقدس بزرگ ہمیشہ مادّی ترقی کو حقارت سے دیکھتے رہے ہیں — اور کیوں نہ دیکھتے؟ کہاں ہیں آج وہ مشینوں کے شیدائی اور ان کی لاٹھی باز پولیس؟ ہمارے لئے وہ دن مبارک ہوگا کہ مشینیں بھی جائیں اور وہ بھی جائیں۔ اس تقریر پر پبلک کی طرف سے برابر پندرہ منٹ خوشی کے نعرے لگتے رہے اور تین دفعہ بندے ماترم کا گیت گایا گیا۔ اس کے بعد پنڈت چھتری صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ پبلک کا خیال تھا کہ داس صاحب کی تقریر کے بعد چھتری صاحب کی تقریر کیا لطف دے گی۔ مگر انھوں نے ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ فرمانے لگے کہ میرا وتنت

میرا دھرم بھارت ماتا کے غریب سپوتوں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔
غریب آدمیوں کو پہلے کون سے تار آتے تھے؟ اب نہ آئیں گے تو کیا ہوگا؟
غریب آدمی کہاں موٹروں میں بیٹھتے تھے؟ ان کے گھروں میں کون سے بجلی
کے لیمپ جلتے تھے؟ میں اُن کا ہوں وہ میرے ہیں۔ ہماری بلا سے اگر بجلی
کے کارخانے بند ہیں تو ہونے دو۔ بھارت ماتا میں کس چیز کا کال ہے؟ ہمارے
ہاتھ زمین کھودنے کے، ہماری ننگی پیٹھیں بوجھ ڈھونے کی عادی ہیں۔ فکر
وہ کریں جن کا کچھ جاتا ہو۔ بھارت ماتا کے لئے وہ دن مبارک ہے کہ غریب
اور امیر میں قدرتی مساوات ہو۔ وہ مساوات جس کے لئے ہمارے رشی کوشش
کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں گوتم نے بادشاہی چھوڑ دی۔ کیا ہمارا ملک مشینیں
نہیں چھوڑ سکتا؟ ہماری رائے یہ ہے کہ مشینیں اگر چلیں بھی تو مت چلاؤ۔ اس
تقریر میں دس منٹ بڑے زور وشور کی واہ واہ ہوئی اور تین دفعہ بھارت ماتا
کا گیت گایا گیا۔ ان کے بعد نرمل بھگت نے تو عجیب سماں پیدا کیا۔ فرمانے لگے
کہ جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ اور یورپ دونوں متفق تھے کہ مشینوں کی پیدا کردہ
تہذیب مہلک ہے۔ مشینوں نے انسانوں کو انسان سے بدل کر بے جان پُرزے
کر دیا تھا۔ موچی، بڑھئی، لوہار کو جو اپنے ہنر کا لطف پہلے تھا وہ مشینوں نے
مفقود کر دیا۔ مشینوں نے ٹھیکیدار پیدا کئے مگر ہنر مند دستکار پیدا نہ کئے۔
یہ پرماتما کی خاص رحمت ہے کہ اب ہر شخص کو اپنے کام میں طبعی جدّت کے
اظہار کا موقع ملے گا۔

ان تقریروں کے ختم ہونے کے بعد شہر میں جا بجا چھوٹے چھوٹے

جلسے ہوئے اور اس شام تک دلکتہ اس قدر خوش تھا کہ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی شہر ایسا خوش ہوا ہو۔

(پیر ۹ بجے رات) :- کوئی آدمی خبر لایا ہے کہ ریلیں سب بند ہو گئیں۔ اس نئی خبر سے شہر میں تلاطم ہے۔

(پیر ۱۰ بجے رات) :- گھوڑے گاڑیوں کے پہیے نہیں چلتے۔ عوام میں پریشانی زیادہ ہے۔ پولیس جان کے خوف سے کہیں چھپ گئی ہے۔

(پیر ۱۱ بجے رات) :- ابھی ابھی مشہور ہوا ہے کہ پستولوں میں گولیاں نہیں چلتیں۔ کئی آدمی میرے سامنے پستول دیوار پر چلا چکے ہیں۔ آواز آتی ہے مگر گولی میں زور نہیں۔ سارا شہر جاگ رہا ہے مگر کوئی شخص تقریر کرنے یا سننے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ ڈر کے مارے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں — مجھے بازاروں سے خوف آتا ہے۔ گھر جا کر سوتا ہوں۔

(منگل صبح ۷ بجے) :- تمام رات دروازے بند کئے پڑا رہا مگر نیند نہ آئی۔ اب باہر نکلا ہوں تو سنتا ہوں کہ شہر میں کہرام ہے۔ آٹا پیسنے کی مشینیں بند ہیں۔ آدھا شہر چکیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

(منگل صبح ساڑھے سات بجے) :- چکی کا پاٹ نہیں پھرتا، چرخہ نہیں چلتا۔ شہر میں لوگ خوف زدہ ہیں۔

(منگل ۹ بجے صبح) :- آٹھ دس بنئے قتل ہو چکے ہیں۔ سب بنئے

گھروں میں چھپ گئے ہیں اور روپیہ اور نوٹ انھوں نے چھپا دیئے ہیں۔
اصل بات یہ ہوئی کہ صبح ہی صبح چند ہوشیار بنئے نوٹ لے کر گھر گھر پھرے
اور دس کے نوٹ کے بدلے نو نو روپیہ لیتے رہے۔ سب غریب آدمیوں
کو یہ پتہ چلا کہ بنئے لوگ اس لئے یہ چال کھیلے ہیں کہ ٹکسال ہو گئی ہوگی
اور روپئے اب نہ بنیں گے تو وہ نوٹ واپس لے کر گئے مگر بنیوں نے روپیہ
واپس دینے سے انکار کیا۔ اس پر تکرار ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی
اور بلوہ ہو گیا۔ اسی وقت یہ بھی مشہور ہو گیا کہ گاؤں میں بھی بنیوں نے
یہی کیا ہے اور وہاں بھی کاشتکار قتل مقاتلے پر اُتر آئے ہیں۔

(منگل ۱۲ بجے دوپہر) :— شہر میں معززین نے ایک حکومت
کمیٹی قائم کی ہے۔ تمام دیا سلائیوں کے بکس اس کمیٹی کے حکم سے جمع کئے
جا رہے ہیں۔ جن لوگوں کو چقماق سے آگ بنانے کا علم ہے، ان کی تلاش
ہو رہی ہے۔ سارے شہر میں سخت خوف ہے کہ اگر دیا سلائیاں ختم ہو گئیں
تو اس سردی کے موسم میں غضب ہو جائے گا۔

(منگل دو بجے بعد دوپہر) :— آدھا شہر بھوکا ہے۔ لوگ بازاروں
میں روٹی فروخت نہیں کرتے اور دکانیں سب بند ہیں۔ حکومت کمیٹی نے
اعلان کیا ہے کہ کل تک سب کے کھانے کا انتظام کمیٹی کی طرف سے ہوگا۔
چوبیس گھنٹے میں صرف ایک چھٹانک بھنے گیہوں اور ایک چھٹانک چنے
ملیں گے۔

(منگل ۴ بجے بعد دوپہر) :— لحظہ بڑے شہروں اور دیہاتوں سے

سخت وحشت ناک خبریں آئی ہیں۔ شہر کے دروازوں پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ ہر شخص لاٹھی لئے پھر رہا ہے۔

(منگل ۵ بجے شام) :۔ غضب ہو گیا۔ پانی کے نل تو بند تھے ہی، اب کنوؤں پر چرخیاں نہیں چلتیں۔ ڈول سے پانی کھینچنا پڑتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں ہر شخص صرف ایک ڈول پانی نکالے۔ مختلف کنوئیں مختلف محلّوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ پانی پر بہت سی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔

(منگل ۶ بجے شام) :۔ بازاروں میں روشنی نہیں۔ لالٹینوں میں تیل نہیں جلتا۔ بتّی اونچی نہیں ہوتی۔ شہر کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ بھو کے آدمی .... کے گھر میں گھس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پورا حصّہ مکان کا غلّے اور دیا سلائی سے بھرا ہے۔ اس پر لوگوں کو بہت غصّہ آیا اور وہ سب مال نکال کر لے گئے .... کو حکومت کمیٹی سے الگ کیا گیا ہے۔ ہر شخص سخت خائف ہے۔

(منگل ۷ بجے شام) :۔ رات بے انتہا نقب زنی کی وارداتیں ہوئی ہیں۔ بہت سے بینک لٹے، بہت سے دفتر، کئی جوہریوں کی دکانیں۔ حکومت کمیٹی نے چند آدمیوں کو جو موقع پر پکڑے گئے تھے بازار میں الٹا لٹکا دیا ہے کہ لوگ خوف کے مارے چوریاں بند کر دیں۔

(بدھ ۹ بجے صبح) :۔ سخت وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں ۔ یہ بھی

سُنا گیا ہے کہ دیہاتی لوگ کو لوٹنے آ رہے ہیں۔ جہلا میں یہ مشہور ہے کہ کسی فقیر
کی بد دعا سے یہ قہر نازل ہوا۔ جن لوگوں نے کہا تھا کہ مشینوں کا بند ہونا بھارت
ماتا کے لئے مبارک ہوگا، وہ خوف کے مارے چھپ گئے۔ میرے پاس والے
گھر میں بچّہ رو رہا ہے کہ امّاں میرا گیند نہیں لڑھکتا۔ ایک نوجوان سائنسداں
کو لوگوں نے بازار میں بہت مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اور کچھ بھی نہیں ہوا، صرف
یہ ہوا کہ کسی برقی تلاطم کی وجہ سے کرۂ زمین کی حرکت بند ہو گئی۔ نہ گاڑی کا پہیا،
نہ کسی مشین کا گول پُرزہ، نہ گیند، کوئی چیز چکّر نہیں لگا سکتی۔ ابھی بیچارے نے
بات بھی ختم نہ کی تھی کہ چند شہریوں نے اُسے پکڑ کر کہا "گھن چکّر کہیں کا ؟
خدا کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ لا تجھے تو چکّر دیں" یہ کہہ کر ان بدمعاشوں
نے اسے پیٹتے پیٹتے بے دم کر دیا۔

(بُدھ ۵ بجے شام) :۔ سارے شہر کی عورتیں اور مرد جمع ہو کر
اپنے اپنے دھرم کے مطابق دعا مانگتے گئے ہیں کہ یہ قہر دُور ہو۔

(بُدھ ۷ بجے شام) :۔ دعا کے جلسے ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک
مذہب والوں نے دوسرے مذہب والوں کی کسی طرح توہین کر دی۔ شہر میں
اس وقت خانہ جنگی زور پر ہے۔ کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہیں۔

(بُدھ رات ۱۰ بجے) :۔ دیہاتی لوگ شہر میں آ گھسے مگر اس سے
خانہ جنگی ختم ہو گئی ہے۔ دیہاتی لوگوں نے شہر میں، بازاروں میں پہرے
بٹھا دیئے ہیں۔ سب اپنے گھروں میں خوف سے بند بیٹھے ہیں۔ اکثر بھوکے
پیاسے ہیں۔ باہر سے دودھ جو آتا تھا وہ کل سے نہیں آیا۔ ہزاروں بچّے

بلبلا رہے ہیں - شہر کی جو چند گائیں ہیں اِن کا دودھ ایک حصّہ دودھ آٹھ حصّے پانی ملا کر صرف ایک سال سے چھوٹے بچّوں کے لئے فروخت ہو رہا ہے۔ میرے ہمسائے میں ایک ماں کی ایک ہی بچّی ہے، جو بیمار ہے، صرف ڈیڑھ سال کی ہے، اُسے کل سے دودھ نہیں ملا - وہ سخت بُری طرح رو رہی ہے۔ ماں رو رو کر دعا کر رہی ہے کہ پرماتما اس بچّی کے اچھا ہونے تک مجھے دودھ عطا کر دے - کہہ رہی ہے "پرماتما اور کچھ نہیں مانگتی - مجھے اس بچّی کی گائے بنا دے - اس معصوم کو بھوکا پیاسا نہ مرنے دے "۔

(اتوار بعد دوپہر) :- جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے حالات قابلِ تحریر نہیں - میں زندہ تھا مگر بھوکا پیاسا نیم پاگل - خوف کے مارے اس سردی میں ایک پُرانے تہہ خانہ میں چُھپا رہا - شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی - آج صبح اس تہہ خانے سے نیم جاں، نیم پاگل، پیاس سے عاجز ہو کر باہر نکلا، تو دیکھتا ہوں کہ بازار میں انگریزی فوج کھڑی ہے اور یہ منادی ہو رہی ہے کہ۔

"سب ٹھیک ہے کوئی خوف نہ کرو"

(پیر - ۱۰ بجے صبح) کل بعد دوپہر پانی پیا تو بیہوش ہو گیا - آج گذشتہ ہفتہ کی تمام مصائب کی وجہ معلوم ہوئی - مریخ ستارے کے سائنس داں اس زمین سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے وہ برقی رَو اپنے وطن سے ہمارے کرّۂ ارض کی طرف بھیجی جس سے ہر قسم کے چکّر کی حرکت بند

ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اس قسم کی برقی رَو نہ بھیجے تو وہ رَو کبھی زمین تک نہ پہنچتی۔ اول تو وہ فضا میں منتشر ہو جاتی اور جو یہاں پہنچتی تو وہ زمین اور زمین کی مشینوں کی حرکت سے کافی کارآمد نہ ہوتی۔ یورپین سائنس دانوں کو چونکہ اس کا خیال تھا، انھوں نے اپنی فوج اور حکومت کو مطلع کر دیا اور یہ لوگ اتنے دن اپنے جہازوں میں سمندر پر رہے۔ مریخ کی برقی رَو کا اثر سمندر پر بہت کم تھا۔

مضامین فلک پیما

نئی دُکان

انسان بیمار ہو تو قسما قسم کے غیر ضروری سوالوں پر ضرورت سے زیادہ غور کر لیتا ہے۔ مثلاً اسی سوال پر کہ زندگی کیا ہے؟

تندرست آدمی کو غور کی فرصت کہاں؟ وہ تو عملی طور پر زندہ جواب یہ دیتا ہے کہ اگر انسان ایڈیٹر ہو تو زندگی یہ ہے کہ ہر روز کسی بھائی ایڈیٹر یا کم از کم گورنمنٹ کو دو چار گرما گرم سُنا دیں، کسی خودسر لیڈر کی مرمّت کر دیں، اپنی من بھاتی روحانی غذا کے دوہرے لگا دیں اور جو اس رائے سے متفق نہ ہوں انھیں زندہ درگور کر دیں۔

اگر انسان تاجر ہو تو زندگی یہ ہے کہ سستا خریدیں، مہنگا بیچیں اور بچپن سے کروڑوں پر کروڑے اور محلوں پر محل بنوانے چلے جائیں۔ لوگوں سے بھی سُنیں، خود بھی کہیں کہ محنت کا پھل ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔

اگر انسان معلّم ہو تو زندگی یہ ہے کہ کوڑ مغز کا ہاتھ اور

ماسٹر صاحب کا بیڈ۔ آئے دن اور ہر سال۔ یہاں تک کہ کتابیں دھڑا دھڑ بکیں۔ امتحان کے پرچے دیکھنے کی فیس آئے۔ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم تعریف کریں اور صوبے بھر میں نام ہو۔

گویا تندرستی کو اس سوال سے کہ زندگی کیا ہے؟ کوئی خاص حکیمانہ دلچسپی نہیں یا یوں کہئے کہ حکمت (فلسفہ) بیماریوں کا مشغلہ ہے۔ مگر حال میں علم النفسیات کے ایک ماہر کی کتاب نظر سے گذری ہے جو اس زرّیں اصول کو ٹھکراتی نظر آتی ہے۔ یہ ماہر سچّے معنوں میں شفاء الملک ہیں۔ بیمار جسموں کا علاج خیالات کی مرہم پٹّی سے کرتے ہیں اور بے انتہا کامیاب ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پوشیدہ اور فراموش شدہ حسّیات کے دھوبی ہیں۔ پہلے چھپے انسانی احساسات کو سرنگ لگاکر باہر نکال لاتے ہیں، پھر ان کو جمع شدہ کثافت و غلاظت سے الگ کرتے ہیں اور جب یہ نکھرے ہوئے احساسات اپنا عکس خود دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مریض سے کہتے ہیں کہ چلو چھٹی اور واقعی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر تو اعتراض نہیں مگر جب ان ماہر صاحب کے علاج کے فلسفے پر غور کرتا ہوں (آج کل طبیعت کچھ نادرست ہے) تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا نکلی اور محض اُردو خواں ابھی تک اپنی پُرانی ادھیڑ بن میں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر ان ماہر صاحب کا صرف ایک

نظریہ پیش کرتا ہوں۔ اگلے وقتوں کے لوگ (یعنی ہم محض اُردو خواں) تو یہ سوچا کرتے تھے کہ کیا جھوٹ بولنا بھی کبھی جائز ہو سکتا ہے؟ مگر ان ماہر صاحب کا خیال اس کے لگ بھگ ہے کہ بعض خاص حالات میں چنداں قابل اعتراض نہیں۔ راستی موجب رضائے خداست کا پتنگ اس نفاست سے انھوں نے کاٹا کہ واہ واہ واہ واہ کرتے چچا سعدی کے دروغ مصلحت آمیز کا گلا بیٹھ گیا ہے۔

حضرت ماہر صاحب فرماتے ہیں کہ بقا بعد از مرگ (روح انسانی کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ) کو یوں تو کون باور کرے گا۔ مگر آج کل یورپ میں جو سینکڑوں پیران نود سالہ موجود ہیں، وہ موت کے انتظار میں کیا سوچیں؟ کیا ان کے لئے بہترین خوش رہنے والا طریقہ نہیں کہ وہ یہ باور کرلیں کہ صرف جسم ہی مرے گا، روح کو ہمیشہ بقا رہے گی اور اگر یہ بہتر طریقہ ہے تو پھر کیوں اس پر اعتراض نہ کیا جائے کہ یہ اعتقاد نہایت لابدی ہے؟ دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب کا ارشاد گویا یہ ہے کہ مذاہب کا پہلا اور آخری تمام تر مقصد یہ ہے کہ وہ دل خوش کن فریبوں کا خوب صورت مجموعہ ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر حضرت اسی پر اکتفا کرتے تو خیر گذرتی۔ مگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شباب کے مذہب سے ایام پختہ کاری کا مذہب قطعی الگ ہونا چاہئے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنی عمر کے مختلف مدارج کے لئے۔ مذاہب کا فرض ہے کہ مختلف پیرایوں

میں فریب کاری کی خدمت سرانجام دیں - ان حضرت کی کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے شبہ ہونے لگا کہ یورپ میں مذاہب کی کوئی نئی دکان تو کھلنے والی نہیں کہ ہر موسم، ہر قد، ہر رنگ، ہر قابلیت اور ہر عمر کے لئے مذہب کا تن زیب وہاں مہیا کر دیں - اگر یہ دکان چل نکلی تو پھر فیشن کی ستم کاریاں غضب ڈھائیں گی -

کاش ہندوستان کوئی ایسا سودیشی سورما (مہاتما کی دکان بند ہونے والی) پیدا کر دے جو یورپ کی اس نئی دکان کے کھلنے سے پہلے ہی ہندوستان میں کاروبار چلا کر دکھلا دے - ہر قسم کے مذہبی تفرقے مٹ جائیں - مختلف مذاہب والے لڑتے اسی لئے ہیں کہ ہر شخص بجائے خود سچے دل سے یقین رکھتا ہے کہ میرا رہنما راستی کا واحد ٹھیکہ دار تھا اور جو مجھ سے متفق نہیں ان کا راستہ غلط ہے - مگر یہ صاحب تو فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے اس کے حسب حال دروغ راستی نما کی ضرورت ہے - گویا انا الحق کی بجائے یہ نئی معرفت نکلنے والی ہے کہ ---

انا الکذب

اور ہر شخص دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم سب حاتم ہیں - اخوت انسانی کا یہ نیا سبق یورپ ہی کو مبارک ہو - ہم پنجابی اُردو خوانوں کے لئے تو اپنے پرانے پیر اچھے ہیں کہ کھاتے ہیں مگر کم از کم کبھی کبھار یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ - یہ کیا

یورپ کا تمسخر ہے کہ خود فریبی کا لطف اٹھاؤ؟ حضرت اکبر تو فرما گئے کہ
اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ مگر میں تو درگاہ الٰہی میں دن رات یہ دعا
کرتا ہوں کہ یورپین دماغ میں یورپین بم پھٹیں۔ کہاں ہم غریب صدق دل
سے پارسائی پر مرنے والے اور کہاں یہ خراباتی کہ جامۂ پارسائی کو بازاری
مگر ضروری پہناوا بیان کرتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ علم کی اور عالم کی سچے دل سے عزّت
کرتے تھے۔ مگر یورپ والے علم کو اور عالم کو جسمانی خوشی کا غلام
تصور کرتے ہیں اور وہاں کے عالم خود اس نئی طرز کے موّید ہیں۔ لعنت
بہ کار شیطاں!

مکرر۔ مگر کہیں یہ نہ ہو کہ یورپ والے ہی سچے ہوں ــــ
وَاللہُ اعلم بالصواب۔

سہ کرر۔ کچھ بھی ہو مگر یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ کاش یہ نئی
دکان سب سے پہلے ہندوستان میں ہی جاری ہو۔ غیرتِ ہندی
اور حب الوطنی کا زبردست تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ آواگون
موت کے بعد ہو۔ یہ صورت ہو جائے کہ اس کی زندگی کے اندر ہی
اندر جو آج بنگالی اور برہمو ہے وہ کل سکھ اور پنجابی ہو۔ جو کل پارسی
اور بمبئی کا سیٹھ تھا وہ آج سرحد کا پٹھان ہو۔ یہ تغیّر و تبدّل اس

سُرعت سے ہو کہ میاں بیوی کو اور بچّے ماں باپ کو نہ پہچانیں۔ انگریز زبانیں سیکھتے سیکھتے عاجز آجائیں اور گھبرا کر یہاں سے چل نکلیں۔ کیا ہی لُطف رہے کہ جو ایک دن پنڈت ہو وہ دوسرے دن چمار اور تیسرے دن والیٔ ریاست کے روپ میں نظر آئے۔ پھر تو کسی کو شبہہ کی گنجائش نہ رہے کہ ہندوستانی اصل میں سب ایک ہیں۔

مَضامین فلک پیما

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانہ بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانہ کی یادگار ہے جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیقِ حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلّا اُٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈے ہونے کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اس آبی زمانہ کے وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس کے نام سے ڈارون کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانہ میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میرے بہت سے احباب جو اس قابل نفریں رسم کے خلاف جہاد کرنے

کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بہت پُر امید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جبتک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے، انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسل خانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں، جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں، ہر دو ہزار افراد کے لئے صرف ایک غسل خانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمۂ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پُر امید ہونے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں انھیں بالتفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانے میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبولِ عومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے

نفرت ہوتی جا رہی ہے اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا "ارے یار! تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجئے کتنا تیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے۔ خودداری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری۔

میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی یہ بتا دے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے؟ تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر:—

صبح ۴ بجے کون نہاتا ہے؟ — پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر۔

صبح ۶ بجے — ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

۸ بجے — پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

۱۰ بجے — صاحب بہادر، لیڈر۔

۱۲ بجے — منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے تو اب صرف دو منٹ پہ آ جائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو بار بار پانی میں ڈبوتے تھے، تو اب

صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہاتے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں جب کہ لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" — اور یقیناً جس طرح ہندوستان کو سوراج حاصل ہو گا، اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائیگی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منھ دیکھ لیتے ہیں، بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے — "آج تو ہم نے غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منھ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانہ کو، آجکل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتے میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں — اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لیکر) واہ، واہ، اس نہانے میں بھی کیا مزہ ہو گا"۔

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں، بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے، کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی

بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں، بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں ---- اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھر آتا ہے، تو سائنٹفک نکتہ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا، تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ اکثر وہ ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح کو اٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے، جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے نبض ٹٹولتا رہتا، کوئی اپنے پتلے کاغذی جسم پر ہاتھ پھیرتا رہتا اور سوچتا کہ یاالٰہی اس جسد خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں ۔ موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں ۔ وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے ۔ اگر " وہ " مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی ۔ بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے، کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں اور بیویوں کو اس خیال سے نہیں نہانے دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں، جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال اُبھارا کہ اُسے ضرور نہانا چاہیئے ۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے، دریا پر گئی اور نہا کر واپس لوٹ آئی ۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے ۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے ۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے ۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے ۔ یہ میری بیوی ہے ۔ نہیں یہ میری بیوی بنے گی ۔ اسے میں لوں گا۔ اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپّا تک پہنچی ۔ طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں ۔

اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں ــــ

"اسے میں نہ دوں گا۔ اسے میں نہ دوں گا۔ یہ میری ہے۔ یہ میری ہے"

نتیجہ :ــ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پرزور پروپگنڈہ کیا جانا چاہیئے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپکا "پروگرام" کیا ہے؟ بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے ــــ

(۱) جو امیر شخص نہائے، اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۴۴ (الف) میں یہ ایزاد کئے جائیں :ــ

ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ......

جو شخص غریب بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا، اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ

پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ بابو جی! غسل خانے میں پانی دیر سے دھرا ہے۔
آپ جلدی نہالیں ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں قلم چھوڑ کر میز کی دراز سے
ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا ؎

جو نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہوائی قلعے

رونا

مثل مشہور ہے کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ "ہم" سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے۔ کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں، گانا تو خیر کبھی کبھی سن لیتے ہیں۔ اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پر چلتے ہوئے۔ لیکن رونا، جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب و محبوب مشغلہ ہے، اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے، اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔ پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے۔ آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوتی ہے تاکہ

چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یوں ہی رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں لوگ کیا کہیں گے؟

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ہر شریف انسان اسے بُرا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بیشک ایک اچھی چیز ہے، لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت۔ بچپن میں جب ہم روتے تھے تو اکثر بار بار پچکارتے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے بلکہ کئی لوگ پچکارتے بھی نہ تھے۔ وہ کہتے تھے، اچھا ہے خوب روؤ۔ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے۔ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو جائے تو لوگ اسے بزدل، زنانہ مزاج، پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بیچارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں یا ایک آدھ ہلکی سی چیخ بھی منھ سے نکل پڑے تو اسے ہیجڑا کہہ دینے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا! آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز جو بچوں کے لئے مفید ہے، ان آدمیوں کے لئے جو اب بچّے نہیں ہیں، کیسے مضر ثابت ہو سکتی ہیں؟

حکیم لوگ بتاتے ہیں کہ رونا بچّوں کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے چھاتی کھلتی ہے، پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں، آنکھوں سے آنسو بہہ کر آنکھ کی

پتلیوں کو صاف کرتے ہیں، ناک کے نتھنوں سے ریشہ جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے۔ رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا، کشتی لڑنے کے بعد دوسری، بہترین ورزش ہے۔ پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں؟ میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت تھی تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے۔ غالباً بچوں کے دن رات رونے کی وجہ ہی سے تپ دق نہیں ہوتا۔ اگر ہم لوگ بھی دن میں دو تین گھنٹے رو لیا کریں، تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نہ دمّہ ہو نہ زکام۔ آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے۔ کتنے بچّے چشمہ لگاتے ہیں؟ اور کون سا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمہ کی حاجت محسوس نہیں کرتا؟ لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدھ مکردھوج، گولڈ پلز، ماء اللحم، شربت فولاد استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان قیمتی دواؤں کے بجائے وہ قدرت کے بیش قیمت اصول بھی برتیں اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں، تو جہاں جسم طاقت ور رہے وہاں دن بھر دل میں امن و سکون بھی رہے اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے، خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے۔

رونا جسم کی غذا ہے۔ نہ صرف جسم کی بلکہ روح کی غذا بھی۔ ایسی مفید
عادت کے لئے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کے لئے عالمگیر
پروپگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی
طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں، اسکولوں اور کالجوں میں رونا
لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے
بڑے آدمی رو رہے ہوں مثلاً ہٹلر، مسولینی، چیانگ کائی شیک —
بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح ڈھاڑ مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت
اچھا اثر پڑے گا اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے۔ ذرا
تصور کیجئے — ایک بڑا سا سینما ہال ہے جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے
زور زور سے رو رہے ہیں۔ کتنا خوب صورت منظر ہے۔ کیا یہ آپ کے
شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح
رونا بھی بطور ورزش کے سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں
کے قریب میدانوں میں لاکھوں آدمی کھڑے کئے جائیں، جو چیخیں مار مار کر
روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنالیں۔ اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ
بھرے جائیں، بلکہ موسیقی کی طرح "ملکۂ گریہ" "رونے کا بادشاہ" وغیرہ
وغیرہ۔ اس پروگرام کو مقبول عام بنانے کے سینکڑوں طریقے برتے جا سکتے
ہیں۔ صرف نمونہ کے لئے چند ایک یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ سند
رہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ بھیج کر الراقم سے
خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں۔ بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بعض بچے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔ وہ اکثر گھنٹوں کیا، کئی کئی دن روتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی کھاتے ہیں، کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگاتار روتے رہتے ہیں۔ میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا نہ کر سکیں گے۔ یوں بھی تو بذات خود یہ کم کارنامہ (Achievement) نہیں اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی کہ واٹرلو کی لڑائی، فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملہ کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے جیسے برسات کی بارش۔ ذرا استاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش پل میں دھوپ۔ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے، لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے۔ عجلت پسندی اور غیر مستقل ارادوں کی، بس ان کا نام لڑکپن ہے — اور شباب تو اس سے بھی بُرا ہے۔ اول تو جوان ہو کر لوگ روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں نہ کوئی دیکھ پائے نہ سُن سکے، جیسے کسی گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یوں ہی کبھی کبھی رسماً آنکھوں سے آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے کہ ہو ہو ہو ہو کر کے لبوں پر جھاگ لا کر

آنسوؤں سے سفید سفید داڑھیوں کو تر کر لیا جائے۔ یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی ہنسی اُڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا قصور ہے۔ دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں، رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر رونا انھوں نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے، رونا ایک ورزش ہے، رونا ایک آرٹ ہے۔ مؤخرالذکر کو بچّوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے۔ میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ دل میں ترحم اور ہمدردی کا جذبۂ عمیق موجزن ہو جاتا ہے اور وہ انھیں بازوؤں میں اٹھا کر پچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے .... اور عورتیں! ـــــ رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے، تو وہ عورت ہے۔ عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن، آنسو سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک ملتجی نگاہ ـــــ اور شاید دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن ایک معاشرتی انقلاب آ جاتا ہے۔ اس کی وجہ

صرف یہ ہے کہ کم بخت مرد رونا نہیں جانتے اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے۔ اٹھو مجاہدو اٹھو، سرفروشی کی تمنا .... وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے کہ ہماری آزادی کی بہتر صورت رونا ہے۔ خوب روؤ، جی بھر کر روؤ۔ دن میں بار بار روؤ۔ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔

ھوائی قلعے

اخبار بینی

جس طرح گاؤں میں تقریباً ہر اَن پڑھ دیہاتی مزدور یا کاشتکار ہونے کے علاوہ "حکیم" ہوتا ہے، اسی طرح شہر میں ہر پڑھا لکھا شہری طالب علم، کلرک ہونے کے علاوہ "اخبار بین" ہوتا ہے۔ مگر اخبار بینوں کی بھی جماعتیں ہیں۔ پہلی جماعت تو اُن اشخاص کی ہے جو وقتاً فوقتاً میاں فضل کریم کے بُک ڈپو کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں "السلام علیکم، خیر و عافیت" جیسی رسمی گفتگو کے بعد مالک دُکان کے کاروبار میں سطحی قسم کی دلچسپی کا اظہار کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں فضل بک ڈپو نہایت عزیز ہے۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل اُٹھا اُٹھا کر یوں پڑھنا شروع کرتے ہیں، گویا فضل بُک ڈپو نہیں بلکہ پبلک لائبریری ہے۔ جہاں "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" مطالعہ کے دوران میں میاں فضل کریم کی آنکھ بچا کر کوئی اچھا شعر یا کسی ایکٹریس کا پتہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے جاتے ہیں اور ہر ایک رسالہ کی ورق گردانی کے بعد اسے نہایت بے اعتنائی سے غلط جگہ پر رکھتے جاتے ہیں۔ جب علمی اور ادبی رسائل پڑھ چکے تو فلمی رسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اوہو! مصوّر نے کتنا ضخیم ایکٹریس نمبر نکالا ہے۔

بھئی سرورق پر ستارہ کی تصویر تو خوب زیب دے رہی ہے ۔ ارے کیا فلم انڈیا نے ابھی سے سالنامہ شایع کر دیا ۔ ذرا دیکھیں کوئی کام کی تصویر ہے بھی یا نہیں ؟" اس طرح ایک دو گھنٹہ اخبار بینی کا شغل جاری رہتا ہے ۔ اس کے بعد میاں فضل کریم پر سوالات کی بوچھار ہو جاتی ہے اور ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ولایتی ڈاک کے آنے میں اس دفعہ اتنی تاخیر کیوں ہوئی ؟ ان کے ڈپو میں ٹرو اسٹوری اور ٹرو رومانس کیوں نظر نہیں آتے ؟ رسالہ ادب عالم کیوں بند ہو گیا ؟ چلتے چلتے انھیں یہ خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ سویرا کا دوماہی نمبر خوب ہے ۔ ہزاروں کی تعداد میں بِکے گا ۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گو رسالہ ہزاروں کی تعداد میں بِکے گا ، ہم کبھی ایک کاپی مول نہیں لیں گے ۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اخبار بینی کے لئے اپنے ہمسائے کے مرہون منت ہیں ۔ اگر وہ ہوسٹل میں رہتے ہیں تو ایک ایسا ساتھی تلاش کرتے ہیں جو روزانہ اخبار خریدنے کا عادی ہو ۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیتے ہیں " اٹھو اٹھو بھائی اب تو پانچ بج گئے ۔ ابھی تک بستر پر پڑے ہو ! " — آپ لیٹے ہی لیٹے جواب دیتے ہیں " سونے بھی دو یار "

" واہ ! سونے کی ایک ہی ۔ اجی اس وقت تک کون سوتا ہے ۔ اچھا دروازہ کھولو ایک ضروری مشورہ کرنا ہے " طوعاً و کرہاً آپ دروازہ کھولتے ہیں اور کرسی پر دراز ہو کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں ۔ پیشتر اس کے کہ

آپ ان کی بدتمیزی کا جواب دے سکیں، وہ میز پر پڑے ہوئے اخبار کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا اخبار انھوں نے ہی خریدا تھا۔ جس وقت گھڑی آٹھ بجاتی ہے وہ چپکے سے اخبار میز پر رکھ کر اور "آج کوئی دل چسپ خبر نہیں ہے" کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ گلی یا محلّہ میں رہتے ہیں تو وہاں بھی آپ کو کئی ایسے حضرات ملیں گے جو سالہا سال سے آپ سے اخبار مانگ کر پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں، وقت بے وقت وہ آپ کی بیٹھک میں آدھمکیں گے اور آپ کے ماتھے کے شکن کو دور کرنے کے لئے دو چار تفریحی یا ہمدردانہ فقرے جڑ دیں گے۔ مثلاً اخاہ! نیا سوٹ پہنا ہے۔ کپڑا تو خوش نما ہے۔ سلا ہوا بھی اچھا ہے۔ مُنّی کا کیا حال ہے؟ چھوٹے میاں کی کھانسی کیسی ہے؟" آپ ان باتوں کا اصلی مقصد سمجھتے ہیں، اس لئے آپ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہئے۔ مگر کیا کیا جائے کہ بیسویں صدی ہے اور جو بات دل میں ہے وہ زبان پر نہیں لائی جاسکتی۔ ورنہ آپ انھیں کہہ سکتے ہیں کہ "اجی مُنّی بچے یا مرے، چھوٹے میاں کو کالی کھانسی ہو یا تپِ دق، آپ تو اخبار پڑھنے آئے ہیں سو اٹھائیے اور پڑھ لیجئے۔

تیسری جماعت ان افراد کی ہے، جو اخبار بینی کے لئے لائبریریوں کے محتاج ہیں۔ اس جماعت میں زیادہ تر ریٹائرڈ کلرک اور سال خوردہ وکلاء ہوتے ہیں۔ یہ اصحاب اصل میں اخبار پڑھنے نہیں بلکہ وقت کاٹنے آتے ہیں۔ لائبریری کے کھُلنے کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ لائبریری کا

طواف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِدھر دروازہ کُھلا اُدھر یہ داخل ہوئے۔
ان کو دیکھ کر کئی نووارد سمجھ لیتے ہیں کہ شاید لائبریری کے انچارج یہی ہیں۔
ان کے پڑھنے کا طریق بھی نرالا ہے۔ یعنی ایک اخبار یا رسالہ گود میں ہے
اور دو اخبار ہاتھ میں۔ حریص اتنے ہیں کہ کسی اور کو اس وقت تک نہ اخبار
اٹھانے دیں گے جب تک "الف" سے لے کر "ی" تک سارا اخبار
پڑھ نہ ڈالیں۔ آپ نے جرأت کر کے ان کی گود میں پڑے ہوئے رسالے
کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ عینک درست کر کے کچھ اس طرح خشم آلود
نگاہوں سے دیکھیں گے گویا کچا ہی چبا جائیں گے۔ آپ نے ہاتھ پیچھے
کھینچ لیا اور انھوں نے خالی ہاتھ رسالے پر رکھ دیا۔ اب آپ منتظر ہیں کہ
وہ رسالہ ان کے پنجے سے چھوٹے تو آپ پڑھیں۔ مگر یہ موہوم خیال
ہے۔ کیونکہ بڑے میاں جب تک اس اخبار کا، جو اُن کے ہاتھ میں ہے،
مطالعہ نہیں کر لیتے رسالہ کی باری نہیں آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ
تنگ آ کر چلے جاتے ہیں۔ مگر جب بھی جاتے ہیں تقریباً اسی قسم کے لوگوں
کو رسائل اور اخبارات پر قابض پاتے ہیں۔

یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ یہ لوگ ہر ایک اخبار میں اُن ہی
خبروں کو دوبارہ یا سہ بارہ پڑھ کر ایک عجیب خوشی محسوس کرتے ہیں اور
گھر آ کر اپنے احباب کے زمرے میں انھی خبروں کی بنا پر بڑے بڑے
عالمانہ اور فاضلانہ تبصرے کرتے ہیں۔ عموماً سنسنی پیدا کرنے والی خبریں
ان کا دل پسند موضوع ہوتی ہیں۔ ابھی سُنا ہے آپ نے "مراد آباد میں

ایک لڑکا لڑکی بن گیا۔" اجی پڑھا آپ نے "بریلی میں عین شادی کے دن دُلہن غائب ہو گئی۔" کیا کہا؟" آپ کو یقین نہیں آتا؟" سترہ تاریخ کا اخبار "احسان" اٹھا کر دیکھ لیجئے۔

ان کے علاوہ اخبار بینوں کی ایک اور جماعت ہے کہ جس سے ریل گاڑی میں سابقہ پڑتا ہے۔ ایک دو باتصویر رسائل، ایک آدھ اخبار لے کر جوں ہی آپ ڈبے میں داخل ہوئے چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوتی ہیں "یہاں بیٹھیے گا، یہاں آیئے گا۔" آپ سیٹ پر بیٹھتے ہیں اور آپ کے ہمسفروں نے باری باری اخبارات اور رسائل مانگنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ پانچ منٹ کے بعد آپ بالکل کورے رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ابھی تو اخبار کھولا بھی نہ تھا۔ اگر یہی بات تھی تو اخبار خریدنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب جوں جوں نئے آدمی نئے اسٹیشنوں پر آتے جاتے ہیں، آپ کے اخبار پر نئے حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اگر صفحہ نمبر ا آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کے ہاتھ میں ہے تو صفحہ نمبر ۱۰ ڈبے کے انتہائی کونے میں بیٹھے ہوئے بزرگ کے ہاتھ میں ہے اور صفحہ نمبر ۱۲ کھینچا تانی میں دو ٹکڑے ہو کر دو شریف آدمیوں کو محظوظ کر رہا ہے۔ تقریباً آپ کا تمام سفر اسی انتظار میں گذر جاتا ہے کہ اخبار ملے اور آپ بھی ایک آدھ خبر پڑھ لیں کہ اسی اثنا میں آپ کی آنکھ لگ گئی تو اخبار تک غائب ہو گیا۔ کیونکہ کوئی بزرگ غلطی سے یا کسی اور وجہ سے کہ آپ کے اخبار پر کسی ایکٹرلیس کی رنگین تصویر تھی، اُترتے وقت اخبار بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔

بہر حال جب منزل مقصود آتی ہے تو آپ اُٹھ کر اخبار کا ایک ایک ورق اکٹھا کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے ہیں کہ پھر بھی اخبار چھوڑنے میں نہیں آتے۔ جب آپ اسٹیشن پر اُترتے ہیں اور اخبار کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پرسوں ترسوں کا پُرانا پرچہ ہے یا ردّی کے چند کاغذ ہیں جن میں شاید آپ کوئی کپڑا یا کتاب لپیٹ کر لائے تھے۔

سنگ وخشت

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

ٹیگور، اقبال، کوہ ہمالیہ اور تاج محل کے علاوہ بہت سی ہستیاں اور اشیا قابل ستائش ہیں۔ مثلاً — مچھر، شاعر، عشاق۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر۔ مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اس لئے بھی مطابقت ہے کہ دونوں شمع روشن ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں۔ نیز جس طرح مچھروں کی کئی قسمیں ہیں، اسی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں:—

(۱) شاعر جو اپنا کلام طبلہ اور سارنگی کے ساتھ گا کر سناتے ہیں۔

(۲) شاعر جو ساری عمر حکومت کے خلاف نظمیں لکھتے ہیں اور آخر میں کسی سرکاری محکمے میں نوکر ہو جاتے ہیں۔

(۳) شاعر جو اپنی نظم کا گراموفون ریکارڈ اپنی آواز میں تیار کرواتے ہیں اور پھر اُسے خود ہی فروخت کرتے ہیں۔

(۴) شاعر جو صرف طوائفوں کے لئے لکھتے ہیں۔

(۵) شاعر جنھوں نے شاعری سکھانے کے لئے کالج کھول

رکھے ہیں۔

شعراء کے بعد اپنے وطن میں عشّاق کا نمبر آتا ہے۔ عشق ہماری گھٹّی میں پڑا ہے۔ چنانچہ اپنے وطن کا ہر شخص مجنوں اور کوہکن کا نام لیوا ہی نہیں بلکہ خود مجنوں اور کوہکن ہے۔ عشاق کی صف اول میں کالج کے طالب علم ہیں۔ ان کا عشق "والہانہ عشق" کہلاتا ہے۔ ان کو ہر لڑکی اور ہر عورت سے عشق ہو جاتا ہے۔ بازار میں سے گزرتی ہوئی عورتوں سے، ٹانگہ یا موٹر میں سوار کالج کی لڑکیوں سے، اسکولوں کی اُستانیوں سے، ہسپتالوں کی نرسوں سے، سینما کی ایکٹریسوں سے، خوب صورت چینی لڑکیوں کی تصویروں سے۔ ان کے اظہار محبت کے طریقے بھی نرالے ہیں۔ معشوق کی طرف گھور گھور کر دیکھنا، معشوق کے قریب سے سرک کر گزرنا، اس پر آوازے کسنا، اس کا نام کالج کی دیواروں، تختۂ سیاہ اور بنچوں پر لکھنا، اس پر کاغذ کے غبارے یا چاک کے ٹکڑے پھینکنا۔ طالب علموں کے بعد عشّاق کا دوسرا بڑا گروہ دکان دار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا عشق "سوقیانہ عشق" کہلاتا ہے۔ انھیں ہر خوب صورت سودا خریدنے والی سے عشق ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے عشق کا اظہار تب کرتے ہیں جب معشوق دُکان سے باہر چلا جاتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے خد وخال، شوخی و شرارت کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر دُکان کے دوسرے آدمیوں یا ہمسایوں سے کیا جاتا ہے۔ عشّاق کی تیسری جماعت

ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پیر سال یا قریب مرگ ہیں۔ ان کا عشق "صوفیانہ عشق" کہلاتا ہے۔ ان کا مقولہ ہے ع

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ عبادت گاہوں، مندروں اور جلسوں میں عورتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عشاق کی آخری جماعت وہ ہے، جس کا عشق "غائبانہ عشق" کہلاتا ہے۔ اس جماعت کے افراد کو نادیدہ محبوب سے عشق ہو جاتا ہے۔ جیسے ریڈیو پر گانے والی تمام طوائفوں سے، خوب صورت برقع میں چلنے والی عورتوں سے، ہالی ووڈ میں کام کرنے والی ایکٹریسوں سے، ملک کی ہر نامور ادیبہ اور شاعرہ سے۔

(۲)

اپنے وطن میں ادبا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھیں کوئی شریف آدمی محلے میں مکان کرائے پر نہیں دیتا۔ کوئی شخص ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہتا اور ان کو ان کی نظموں اور مضامین کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ مگر پھر بھی ان کا کافی احترام کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی ادیب ہوا پر پلتے ہیں ـــ چنانچہ جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے، اتنا ہی وہ افلاس زدہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا ہندوستانی ادیب وہ ہے جس کے مرنے پر اس کے کفنانے اور دفنانے کے اخراجات میونسپل کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان میں جب

مصنف مرنے ہیں تو اپنے پیچھے لاکھوں پونڈ کی جائدادیں چھوڑ جاتے ہیں ۔ ہندوستان میں جب کوئی مصنف مرتا ہے، تو وہ یہ چھوڑ جاتا ہے — ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، غلیظ بستر، چند لوٹے اور قرضہ اتنا کہ مرحوم کی سات پشتیں بھی ادا نہ کر سکیں ۔ اپنے وطن میں ادبا کی شاذ ہی دریا دلی سے تعریف کی جاتی ہے ۔ اگر وہ کوئی اچھی چیز لکھیں تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے چرائی ہے اور اگر چرائی نہیں تو انھوں نے کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ کر ڈالا ہے اور اگر کبھی کبھار مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے واقعی اچھی چیز لکھی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی وہ رذیل قسم کے ادیب ہیں، جنھیں موپساں اور چیخوف سے دور کی بھی نسبت نہیں ۔ چاہے وہ کتنا زور ماریں ان کی عظمت کا اعتراف ہمیشہ دبی زبان میں کیا جاتا ہے اور تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ ہنوز دلی دور است ۔

(۳)

اپنے وطن میں تنقید کا بھی عجب معیار ہے ۔ صرف وہی کتابیں قابلِ قدر سمجھی جاتی ہیں جن کو ہر شریف آدمی بخوشی اپنی ماں یا بہن کے ہاتھ میں دے سکتا ہے یعنی جن میں کوئی اصلاح کا پہلو موجود ہے ۔ ہر ایک شاعر اور افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شاعر، افسانہ نویس اور ناولسٹ ہونے سے پہلے پیغمبر، واعظ اور خطیب ہو ۔ اس کی ہر کہانی سبق آموز اور ہر نظم نتیجہ خیز ہو ۔ چنانچہ اگر ناول لکھے تو یہ ضرور دکھائے کہ

نیک آدمی کو نیکی کی جزا ہر حال میں ملتی ہے اور بدمعاش اپنے جرم کی پاداش میں ضرور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ ہندوستانی بیوی اپنے بدکار خاوند کی خباثت کے باوجود اس سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو وہ ہر مذہبی اصول کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔

(۴)

اپنے ملک کی فلمیں بھی عجیب ہیں۔ پندرہ پندرہ ہزار فٹ لمبی کہانیوں میں نہ تسلسل ہے نہ پلاٹ۔ ہر ایک تصویر میں وہی ہیرو، وہی ہیروئن۔ ایک درجن کے قریب گانے۔ پانچ چھ ناچ۔ بوس و کنار کے بغیر محبت۔ بے ربط مکالمے۔ بے معنی گیت۔ غیر قدرتی انجام۔ واقعی یہ عجیب ملک ہے۔ جہاں ڈائرکٹر کہانی لکھنے کے علاوہ گانے اور مکالمے بھی خود لکھتا ہے۔ ہیرو کا پارٹ بھی خود ادا کرتا ہے اور دو تین بار ہیروئن سے جھوٹ موٹ بیاہ رچانے کے بعد واقعی اُس سے شادی کر لیتا ہے۔

(۵)

اپنے وطن میں فحش اشتہارات کی بھی افراط ہے۔ دیواروں پر، درختوں کے تنے کے ساتھ، نوٹس بورڈوں پر یہ اشتہار جلی قلم میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جگہ ان

اشتہارات سے بچی ہے، تو وہ آسمان ہی ہے۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر ایک غیر ملک کا باشندہ یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہندوستان کا بچّہ بچّہ جنسی امراض میں مبتلا ہے۔ معزز سے معزز اخبار میں یہ اشتہار نمایاں جگہ پر شائع کئے جاتے ہیں مگر ہم سب ان سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ہمارا بڑے سے بڑا لیڈر بھی ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔

(۶)

اپنے وطن میں ہر اکیلی نوجوان لڑکی یا عورت شک کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ اکیلی سیر کو جا رہی ہے تو شکار پھانسنے کے لئے جا رہی ہے۔ اگر وہ اکیلی سفر کر رہی ہے تو ضرور حسن فروش ہے۔ اگر وہ تن تنہا سکونت پذیر ہے تو ہم اس پر گھناؤنے سے گھناؤنا الزام لگانے میں حق بجانب ہیں۔ اگر وہ کسی ایسے آدمی سے بات چیت کر رہی ہے، جو اس کا باپ یا بھائی نہیں، تو ضرور اس سے اظہار محبت کر رہی ہے۔ اگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ اگر وہ اندھیرے میں کہیں جا رہی ہے تو ضرور اپنے عاشق کے گھر جا رہی ہے اور اگر وہ تاریکی میں کہیں سے آ رہی ہے تو اپنے آشنا کے گھر سے آ رہی ہے۔ چونکہ اپنے وطن میں سوائے طوائف کے ہر ایک عورت غلام ہے اس لئے ہر آزاد خیال عورت پر ہمیں طوائف کا شبہ ہوتا ہے۔

(۷)

واقعی اپنے وطن میں سب کچھ ہے .... نفاق، جہالت، غلاظت، مذہبی جنون، ہمارے اسٹیشنوں کے مسافر خانے، ہمارے ہوٹل، ریل گاڑیاں غلاظت سے پُر ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے تحمل کا یہ حال ہے کہ ہم سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، کیونکہ ہمیں مسافر خانے یا ہوٹل میں صرف ایک آدھ گھنٹہ ٹھہرنا ہے، اس لئے اگر وہ گندے بھی ہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ہمارے مذہبی جنون اور جہالت کی یہ حالت ہے کہ ہم جاہل سے جاہل مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کو تیار ہیں۔ وہ جس طرح ہمیں نچاتے ہیں، ہم ناچتے ہیں۔ نہ صرف ناچتے ہیں بلکہ ان کے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کیونکہ مسجد کے سامنے ہندوؤں نے باجہ بجایا ہے، اس لئے ہندو کشتنی ہیں۔ حالانکہ ابھی ابھی انگریزی پلٹن کا بینڈ قیامت برپا کرتا ہوا مسجد سے گزرا تھا۔ ابھی جس وقت مولوی صاحب نہایت انہماک کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے۔ کیونکہ اس مسلمان نے گائے ذبح کی ہے اس لئے اس کی گردن اڑا دو۔ حالانکہ ہر روز انگریزی چھاؤنیوں میں فوجیوں کے لئے ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اپنے وطن میں مذہبی پیشوا ہمیشہ مزے میں اور مذہب ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے۔ مذہب کا اپنے وطن میں بہترین استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم کو لڑوایا جاتا ہے۔ مذہب کی بدولت فرقہ وارانہ فسادات کروائے جاتے ہیں تو اسی کی بدولت اور غلامی

کی زنجیروں کو مضبوط بنایا جاتا ہے تو وہ بھی اسی کی بدولت۔ عجیب بات یہ ہے کہ متعدّد بار زک اٹھانے کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے ہمیں اُلّو بنا رہے ہیں۔

(۸)

مگر کہاں تک ذکر کیا جائے کہ اپنے وطن میں کیا کیا ہے اور کیا کیا نہیں۔ اپنے وطن میں سڑکیں ہیں جن پر رات کو کبھی روشنی نہیں ہوتی اور جن پر دن میں کبھی چھڑکاؤ نہیں ہوتا۔ ایسے جوتشی اور عامل ہیں، جنھیں یہ معلوم نہیں کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے مگر جو ہر وقت بتا سکتے ہیں کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ ایسی دُکانیں ہیں جو عین بدر رو کے اوپر واقع ہیں مگر جہاں اشیا خریدنے میں کسی کو عذر نہیں۔ ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشن دان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ ایسی کم سن بیوائیں ہیں جنھوں نے اپنے خاوند کا چہرہ تک نہیں دیکھا .... ایسے سیاست داں ہیں جن کے نزدیک سیاستدانی کی انتہا چرخہ کاتنے میں ہے .... اینگلو انڈین مصنفوں کی نظر میں ہندوستان مہاراجوں، ہاتھیوں اور سپیروں کا ملک ہے۔ حالانکہ اچھی طرح دیکھا جائے تو یہ نقّالوں، غدّاروں اور کنگالوں کا وطن ہے۔

اپنے وطن میں محبّت گناہ ہے اور عشق جرم۔ مذہب پر جبا شُمر اعتراض کرنا کفر ہے اور پُرانی روش کو چھوڑنا غدّاری۔ صرف ایک چیز

اپنے وطن میں نہیں اور وہ ہے خوبصورت عورتیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے راجاؤں، نوابوں اور شعرا کو خوب صورت عورتیں لانے کے لئے پیرس اور لندن جانا پڑتا ہے۔ اس چیز کے علاوہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے۔ ابو الاثر بجا فرماتے ہیں ؎

اپنے وطن کے دن رات نیارے
باغ اور آکاش پھول اور ستارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

تکلّفات

تھانوی ہونا دوسری بات ہے مگر یہ خاکسار حاضر ہوا ہے اسی لکھنؤ سے جہاں "پہلے آپ" اور "نہیں حضت پہلے آپ" کے تکلفات میں ٹرین چھوڑ دی جاتی ہے مگر وضع نہیں چھوڑی جاتی۔ اب ذرا خاکسار کا لکھنؤ سے حاضر ہونا ملاحظہ فرمایئے اور گنتی کے پندرہ منٹ ریڈیو پر مضمون پڑھنے کے لئے دیکھیئے۔ انصاف سے کہیئے گا کہ ایک لکھنؤ سے اس پندرہ منٹ میں کتنی دیر اپنی شیروانی کا دامن درست کر کے ایک مناسب زاویہ سے بیٹھنے کی کوشش کرے گا، کتنی دیر میں ریشمی رومال سے لبوں کو صاف کرے گا، کتنی دیر کھنکھار کر آواز کے سُر درست کرے گا، کتنی دیر شرمائے گا اور کتنی دیر اس کا انتظار کرے گا کہ سامعین "ارشاد" کہہ کر تقاضہ کریں۔ یہاں کُل پندرہ منٹ ہیں۔ حالانکہ یقین جانیئے کہ ان میں سے ہر ادا کے لئے فرداً فرداً پندرہ منٹ کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مضمون سنایا بھی جائے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ خاکسار لکھنؤ سے حاضر ہونے کی رعایت سے

محض ناسازیٔ طبع یعنی زکام، نزلہ، گلو گرفتگی، اختلاج قلب، دوران سر وغیرہ تمام ممکن اور ناممکن امراض کو بطورِ عذر پیش کر کے معذرت چاہی ہے اور پھر جب تمام ہندوستان کے ریڈیو نواز بصیغۂ غائب اور ریڈیو اسٹیشن دہلی والے بصیغۂ حاضر اس خاکسار سے اصرار کریں تو یہ کمترین گویا مجبور ہو کر محض تعمیل ارشاد میں ایک شعر حاصل مضمون روانی کے ساتھ سُنا جائے۔ مگر ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے منٹوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ضرورت ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ گھڑی دیکھتے رہو، جیسے ہی چھوٹی سوئی آٹھ پر اور بڑی بارہ پر پہنچے فوراً شروع کر دو۔ اپنا مضمون جو ایک ایک سکنڈ کے حساب سے ٹھیک اس وقت ختم ہو جائے جبکہ بڑی سوئی تین پر پہنچ جائے۔ گویا ہم لکھنؤ سے آنے والے ایک آدمی نہیں، بلکہ سوئزرلینڈ سے آنے والی کوئی ٹائم پیس ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کو اس باقاعدگی اور تہذیب کے مقابلہ میں شیخ ابراہیم ذوق سے اتفاق ہو جن کا نظریہ یہ تھا کہ؎

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر غور کیجئے تو یہ تعلیم سوائے خود غرضی کے اور کچھ نہیں سکھاتی۔ یقیناً آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے۔ مگر جن کے ساتھ تکلف نہیں کرتے اس غریب کی کیا گت بناتے ہیں، اس پر بھی تو غور کرنا چاہئے۔

یہ کیا کہ محض اپنی تکلیف دور کرنے کی تو ایک راہ نکال لی، اس کے بعد تمام دنیا گئی جہنم میں۔ لیکن لکھنؤ کا تکلف "ایثار، قربانی، نفس کشی" اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی خوبیاں سکھاتا ہے۔ اس تکلف کے ماتحت انسان ہر مصیبت خود ہی جھیل لے جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بے تکلف بن کر دوسروں کے لئے عذاب بن جائے۔ مارے بے تکلفی کے بغیر کسی اطلاع کے رات کو ٹھیک دس بجے نازل ہو گئے کسی دوست کے یہاں اور مان نہ مان میں تیرا مہمان کے اصول پر عمل کرتے ہوئے طلب کیا اس سے کھانا مع چند فرمائشات کے جن کی تعمیل کے لئے خواہ وہ چوری کرے یا بال بچوں کا پیٹ کاٹے، کسی سے قرض لائے یا خود پیٹ پر پتھر باندھ کر سو رہے۔ مگر آپ کی بلا سے، آپ کو اپنے کام سے کام۔ ایسے مہمان کے لئے میزبان کے دل کی گہرائیوں سے جو بددعائیں نکلتی ہیں وہ قبول ہوتی ہوں یا نہ ہوں، مگر شیخ ابراہیم ذوق کی روح ضرور شرمندہ ہوتی ہوگی کہ وہ کیسا غلط نظریہ قائم کر گئے ہیں۔ ایک لکھنوی صاحب کے لئے اس قسم کی بے تکلفی قطعاً ناممکن ہے۔ وہ اگر نا وقت کسی شہر میں پہنچے گا بھی تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہلنا کر کے دیوار پر چسپاں ٹائم ٹیبل کو بار بار رواں اور ہجے لگا کر پڑھ کر، میر تقی میر کی غزلیں گنگنا کر وقت کاٹ دے گا۔ صبح شریف آدمیوں کی طرح مہمان بن کر میزبان کے دروازہ پر پہنچے گا اور اس وقت یہ عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ جب میزبان ناشتہ چنے گا تو یہ مرد معقول بلا مبالغہ دو تین فاقوں سے بھی ہوگا تو یہی کہے گا کہ حضرت میں تو ناشتہ کر کے

حاضر ہوا ہوں۔ اب یہ اور بات ہے کہ قسماقسمی اور اصرار سے مجبور ہو کر ناشتہ
کو اس صفائی سے تناول فرما جائے کہ صرف میزبان کو تکلفاً چھوڑ دے۔

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے تکلف کو دنیا نے سمجھنے کی
کوشش نہیں کی اور اس کا مذاق اڑا کر اس کے فوائد کو نظر انداز کر دیا۔ ورنہ
یہی تکلف ان تمام سیاسی، ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل
ثابت ہوتا جو آج کل مفکرین عالم اور مدبرین وقت کا دماغ چرخ کیے
ہوئے ہیں۔ بے تکلفی اور اکھڑ پن ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ تخفیف اور توسیع
اسلحہ کی گتھی کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہندوستان کے لئے جدید
دستور کی بھی ضرورت پیش آ رہی ہے اور اس دستور کے لئے ہڑتال کی
بھی ضرورت ہے۔ اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور چین و جاپان میں
الگ کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی
ہے اور امن و سکون کا کہیں پتہ نہیں۔ کاش تکلف کو اس طرح نظر انداز
نہ کیا گیا ہوتا اور بجائے اس کے کہ آج تخفیف و توسیع اسلحہ کی گتھیاں
سلجھائی جا رہی ہیں، یہ ہوتا کہ جرمنی برطانیہ کو لکھتا کہ اگر آپ کو ناگوار نہ
ہو تو میں ایک ہزار توپیں بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے جواب میں برطانیہ
پانچ سو توپیں مع اس مضمون کے خط بھیج دیتا کہ آپ نے غیریت برتی اور
بجائے برطانیہ سے توپیں طلب کرنے کے خود توپیں بنانے کا ارادہ ظاہر
کیا ہے۔ بہرحال اس وقت برطانیہ کے پاس پانچ سو توپیں تیار تھیں،

جو ارسال خدمت ہیں۔ باقی انشاء اللہ بہت جلد تیار کرا کے روانہ کی جائیگی۔ مگر آپ کو ہمارے سر کی قسم کہ ان کو اپنی ہی چیز سمجھ کر قبول فرمائیے گا اور آئندہ بھی خدمت لائق سے یاد فرماتے رہئے گا۔ ان کے جواب میں جرمنی کی طرف سے ان توپوں کی قیمت روانہ ہوئی۔ پھر مسٹر بالڈون اور ہر ہٹلر کے درمیان اسی قسم کی بحری پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا کہ نہیں حضرت یہ نہیں ہو گا۔

"نہیں حضرت یہ نہ ہو گا"

"واللہ بھائی بالڈون آپ کو یہ دام تو قبول ہی کرنا پڑیں گے"

"آپ کے سر عزیز کی قسم ہٹلر صاحب یہ قیامت تک نہ ہو گا"

"ارے حضرت آپ کی توپیں ہماری تھیں تو ہمارا روپیہ آپ کا ہے"

"یہ صحیح ہے مگر آپ غیریت برت رہے ہیں"

"اس رقم کو واپس کر کے دل شکنی نہ فرمائیے"

"یہ رقم اور وہ توپیں سب آپ پر نچھاور ہیں"

"اس کے یہ معنی ہوئے کہ آئندہ کوئی فرمائش نہ ہو"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمائش غیروں میں ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے"

"تو آپ کو ہمارے سر کی قسم اس روپیہ کو بھی آپ اپنا ہی سمجھئے"

"اچھا آپ نے دے دیا، ہم نے پا لیا۔ اب یہ ہماری طرف سے جرمن قوم کے بچوں کو مٹھائی کے لئے دے دیجئے"

"قسم ہے ہمارے قومی جھنڈے کی جانِ عزیز کی کہ یہ نہ ہوگا۔"

"آپ تو واللہ مجبور کر رہے ہیں۔"

"اچھا تو اس کے معاوضہ میں نہ سہی تحفتاً دو چار سو ہوائی جہاز ہی قبول کر لیجئے۔"

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت نہیں، یہ ہماری خوشی ہے۔"

"آپ کی خوشی ہے تو اچھا یہی سہی۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کے رواسم اور ان تعلقات کے بعد تخفیف یا توسیع اسلحہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ آپ اس ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض کر سکتے ہیں کہ شاید جنگ چھڑ جاتی۔ مگر جنگ میں بھی اس تکلف کی کارفرمائی جس حد تک مفید ہو سکتی ہے، اس کا تصوّر بھی بے تکلف دنیا نہیں کر سکتی۔ اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو گئی تو دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابلہ پر برسوں صف آرا کھڑے رہتے اور حملہ کے سلسلہ میں دونوں طرف سے اصرار ہوتا کہ "آپ" اور "نہیں حضرت پہلے آپ"۔

رونا تو آتا ہے اس گہوارۂ تکلف ہندوستان پر...... آج یہاں بھی تکلف کا نام و نشان نہیں ہے۔ کہیں جدید دستور کی ضرورت ہے اور کہیں جدید دستور کے لئے ہڑتال کی ضرورت۔ کہیں حقوق کا سوال ہے اور کہیں:

ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

حالانکہ اگر غور کیجئے تو تکلف کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کا حقوق طلب کرنا ہی نہایت چھوٹی اور گری ہوئی بات ہے۔ ہمارے بزرگ اگر اپنی کوئی چیز کسی کو دے دیتے تھے تو اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے وہ چیز دی اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ مرتے دم تک اس چیز کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا۔ اس کو واپس مانگنا یا اس کا معاوضہ لینا تو درکنار۔ خواہ پھر فاقوں پر نوبت پہنچ جائے یا چیتھڑوں سے لگ جائیں مگر جان کے ساتھ آن نہیں جا سکتی تھی اور آج کل کا زمانہ ہے کہ سرکار کو جو ہندوستان دیا تھا اس کو نہایت فخر کے ساتھ طلب کیا جا رہا ہے۔ نہ ہوئے یہ کانگریس والے لکھنوی۔ آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر سرکار خود بھی ہندوستان واپس دینا چاہتی تو یہی کہا جاتا کہ کیوں سرکار! اب یوں بھی ذلیل کیا جائے گا ہم کو۔ واللہ اس قدر تو ذلیل نہ کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اب کسی قابل نہیں مگر اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں کہ اپنی دی ہوئی چیز واپس لیں۔ کاش ہم اس قابل ہوتے کہ ایسے ایسے پچاس ہندوستان آپ پر قربان کر دیتے۔ مگر کیا کہیں کہ ؏

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہندوستان کے سلسلے میں اپنا پرایا کیا؟ آخر ہم خود کس کے ہیں۔ یقین جانئے کہ آپ کے غلام ہیں اور آپ ہیں کہ ہم ہی سے یہ غیریت برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شریفانہ تکلف کے جواب میں سرکار کی طرف سے بھی کوئی بخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب ہندوستان ہی نے تکلف چھوڑ دیا

ہے تو دوسروں کا کیا سوال ۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کے سلسلہ میں اعداد و شمار اور فیصدی تک کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ حالانکہ پہلے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو حساب دوستاں در دل کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا ۔ اور حد یہ ہے کہ اس چھچھورپن سے بچنے کے لئے اگلے وقتوں کے لوگ دس سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتے تھے اور جن کو آج کل گیارہ کہا جاتا ہے، اس کو وہ بھولے بھالے شرفاء دس کے اوپر ایک کہا کرتے تھے اور امن و سکون کی نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ نہ حقوق نیابت کا سوال تھا، نہ مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کا جھگڑا تھا، نہ الکشن بازی ۔ بلکہ اس قسم کے تمام حوصلے نہایت غیر مضرت رساں طریقہ پر بٹیر بازی سے پورے کر لئے جاتے تھے ۔ آپ نے بٹیر بازی کا مضحکہ اڑایا مگر اس انسانوں کی پالی یعنی الکشن پر غور نہ کیا کہ یہ کیا ہے ۔ بٹیر کا کیا، وہ تو ایک ادنیٰ سا جانور تھا، فرض کر لیجئے کہ وہ بھاگ گیا تو بھگّا کہا گیا ۔ مگر اس دَور انقلاب میں یہ رجعتِ قہقری ملاحظہ ہو کہ بٹیروں کی جگہ انسانوں نے لے لی ہے ۔ اچھے دل بُرے ہوتے ہیں ۔ بٹیر چھچھّے نہیں ہوتے بلکہ انسانوں میں سر پھٹول ہوتی ہے اور اسی پر سب کو بڑا ناز ہے ۔ لکھنؤ کا تکلف تو ایک ڈھکوسلا تھا مگر یہ تمام باتیں آخر کیا ہیں ؟

خیر یہ باتیں تو اس لئے عرض کر دیں کہ بات میں بات پیدا ہو گئی تھی اور مقطع میں نہیں بلکہ مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات پیدا ہو گئی تھی جس سے مقصود

ترک مبحث نہیں ہے بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ تکلفات کو چھوڑنے والے کس حد تک غلط راستہ پر ہیں۔ لیکن ایک لکھنؤ سے حاضر ہونے والے کے لئے یہ کس قدر دقّت کی بات ہے کہ وہ اس روایتی تکلف کو یک لخت نظر انداز کر دے اور گھڑی کی سوئی کے اشارہ پر عمل پیرا ہو کر مضمون سُنانا شروع کر دے۔ پھر لطف یہ ہے کہ سُنائیے۔ ماحول یہ ہے کہ ایک تنہا کمرہ ہے، جس میں بیٹھے ہوئے مضمون پڑھ رہے ہیں بہ آواز بلند۔ یہ سچ ہے کہ ع

سارى دنیا گوش بر آواز ہے

مگر بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قید تنہائی میں باغیانہ تقریر کرنے کی مشق کر رہے ہیں یا در و دیوار سے باتیں ہوتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب سامعین سے سمع خراشی کی معذرت نہ چاہیں اور سامعین ہر جملہ پر دھی جا بجا مکرر ارشاد نہ کہیں تو سُنانے والے کا کیا خاک دل لگے گا؟ پھر مصیبت یہ کہ ہم بالکل آلۂ نشر الصوت کے رحم و کرم پر ہیں اور آلۂ نشر الصوت سے زیادہ ہندوستان کی موسمی حالت پر ہمارے اس مضمون کی تقریر کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجیے کہ کہیں بادل گرج رہا ہے تو سُننے والے بھی کہیں گے کہ سخت بد تمیز ہے یہ شخص بھی مضمون سُناتے ہوئے اس قدر واضح قسم کی ڈکار لیتا ہے۔ بلکہ اکثر حضرات کو تو یہ محسوس ہوگا کہ مضمون سُناتے سُناتے اس خاکسار پر چھت پھٹ پڑی ہے یا یہ خاکسار مع کرسی اور میز کے اُلٹ گیا ہے۔ بہر صورت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک مضمون سُنانے والے کی کیا کیا گت بنتی ہوگی۔ مگر یہ تمام باتیں مقدرات سے

وابستہ سمجھ لی جائیں تو ریڈیو والوں کو اس کا خیال تو رکھنا ہی چاہیئے کہ ایک پنجابی اور ایک بنگالی، ایک سرحدی اور لکھنوی سب کے لئے پندرہ منٹ کی قید تو ایک قسم کی زیادتی سی ہے نا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اس تمہید میں مضمون سے قبل پندرہ منٹ ختم۔

برقِ تبسّم

بابو

بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھننگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی ہوئی نظر آئے اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ ہو سکے کہ سائنس داں نے اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خطِ شکست لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی اور عینک بھی لگاتی ہے۔ کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے اور واقعی اگر بابو کی زندگی کا جائزہ لیجئے اور اس کے پروگرام پر غور کیجئے تو آپ کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ انسان تو خیر برائے نام ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اس کے مشاغل مشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ روزانہ وقت مقررہ پر دفتر آنا، دفتر آکر ایک ہی قسم کے کام کو روزانہ انجام دینا، مقررہ وقت پر دفتر سے جانا اور ایک مقررہ نظام کے ماتحت گھریلو زندگی بسر کرنا۔ عام انسانوں کی طرح بابو کی زندگی میں مختلف قسم کے مدّوجزر بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کے صرف دو ٹکڑے ہوتے ہیں؛ گھر اور دفتر، دفتر

اور گھر — اور یہ دونوں کرتے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بھی بن کر رہ جاتے ہیں۔ یعنی بابو کا گھر دفتر کے سہارے قائم رہتا ہے اور دفتر گھر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر بابو کو گھر کی فکر نہ ہو تو دفتر کی ہرگز پروا نہ کرے۔ اور اگر دفتر نہ ہو تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر باوجود اس ربط کے بابو کی گھریلو اور دفتری زندگی میں ایک مستقل تضاد ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو اس تضاد میں بھی آپ کو یکسانیت کی جھلک نظر آئے گی۔ بلکہ اگر بابو سے پوچھئے تو شاید وہ گھبرا کر گھر کو دفتر اور دفتر کو گھر کہہ جائے۔ اس لئے کہ اس بیچارے کی زندگی بحصۂ مساوی جن دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے، ان میں ایک کو وہ گھر کہتا ہے اور ایک کو دفتر — اور دونوں جگہوں کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں اس پر کچھ اس طرح ہوتی ہیں کہ اس کو جلدی میں گھر اور دفتر میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ غور کرنے کے بعد وہ بتا سکتا ہے کہ دفتر اور گھر دونوں میں گھر کون سا ہے اور دفتر کون سا۔

بابو نے اس غلط مبحث سے بچنے کے لئے دفتر اور گھر میں چند موٹی موٹی پہچانیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لی ہیں تاکہ گھر اور دفتر میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو سکے۔ مثلاً گھر پر بیوائن ہوتی ہیں اور دفتر میں صاحب۔ گھر پر بچے ہوتے ہیں اور دفتر میں اس کے دوسرے ہمعصر بابو۔ گھر پر کہار ہوتا ہے اور دفتر میں چپراسی۔ گھر پر کھانے کو ملتا ہے اور دفتر میں کھایا پیا ایک کیا جاتا ہے۔ گھر پر لیٹا جاتا ہے اور دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر پر

نون تیل لکڑی کی فکر ہوتی ہے اور دفتر میں کیش بک، اکاؤنٹ بک اور لیجر کی فکر۔ گھر پر دھوتی باندھی جاتی ہے اور دفتر میں دھوتی کے اوپر ایک شرعی پائجامہ نما پتلون۔ گھر میں حقہ یا ناریل پیا جاتا ہے اور دفتر میں آنکھ بچا کر بیڑی۔ گھر پر بچے پریشان کرتے ہیں اور دفتر میں اہلِ معاملہ اور اہلِ غرض حضرات۔ گھر میں بیوی کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے اور دفتر میں بڑے بابو یا چھوٹے صاحب کی۔ ان چند موٹی موٹی پہچانوں میں سے ایک بابو نہایت آسانی کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ گھر پر یا دفتر میں، دفتر میں یا گھر پر۔

بابوؤں کی سینکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان سب کی زندگی کم و بیش ملتی جلتی ہوتی ہے اور ان سب کے حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ڈاک بابو ہوں یا تار بابو، ٹکٹ بابو ہوں یا اور کسی قسم کے بابو۔ مگر ان سب کے حالات زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں کثرتِ کار اور گھر پر کثرتِ اولاد۔ دفتر میں ترقی کی فکر اور گھر پر بیوائن کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم۔ دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور گھر پر رام چرن کی ہتاری کا خطرہ۔ دفتر میں اہلِ معاملہ کے سامنے شیر اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلی اور گھر پر بچوں کے باپ اور بچوں کی ماں کے صاحبزادے۔ گھر پر مہاجن سے قرض لینے کی فکر اور دفتر میں پہلی تاریخ کے لئے دن گننا۔ مختصر یہ کہ ایک بابو کی تمام

سیاست، تمام قابلیت اور تمام اہلیت کا دائرہ محدود ہے گھر اور دفتر کے درمیان۔ اس کے علاوہ خواہ دنیا میں کچھ ہو اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی بلا سے اسپین کی حکومت تبدیل ہو جائے، اس کو تو بڑے صاحب کی تبدیلی کی خبر بھی عین وقت پر ہوتی ہے۔ ہر ہٹلر کے ارادے کیا ہیں اس پر وہ غور کرے جس کو بڑے بابو کے ارادوں کو سمجھنے سے فرصت ہو۔ جدید دستور کے نشیب و فراز اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دفتر میں جو جدید انتظام ہوتا ہے وہ اس کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جشن تاج پوشی میں اس کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ دفتر میں ایک دن کی چھٹی تھی اور اسی دن گھر کے لئے جنس خرید کر لانا پڑی اور تمام دن غلّہ کی منڈی میں ترازو اور باٹ سے واسطہ پڑا۔ ہندوستان کے سیاسی جمود کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو بہر حال وہ تو یہ جانتا ہے کہ اس کے دفتر پر جمود کی کیفیت نہ طاری تھی اور نہ آئندہ اس قسم کی کوئی امید ہے۔ جمعیۃ اقوام کا چونکہ اس کے دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا وہ اس سے دل چسپی لینا ہی نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے یا ہندی، اس کے لئے دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ اس کو تو گھر میں ہندوستانی بولنا ہے اور دفتر میں انگریزی لکھنا ہے۔ فقیرا پی کی سرگرمیوں پر وہ اس لئے غور نہیں کرتا کہ جہاں تک اس کا خیال ہے فقیرا پی کا کوئی اثر اس کے دفتری معاملات پر نہیں پڑ سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کے تمام معاملات کو اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک سے اگر دیکھتا بھی ہے تو اپنے سے غیر متعلق سمجھ کر نہایت مہمل

سمجھتا ہے ورنہ عام طور پر وہ اپنے فائلوں ہی کو ختم کرنے اور پچھڑے ہوئے کام کو نپٹانے میں ایسا مصروف رہتا ہے کہ اس کو دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔

دفتر کی مصروفیتوں سے کچھ کم اس کے گھر کی مصروفیتیں نہیں ہوتیں۔ اگر آپ بابو کی گھریلو زندگی دیکھیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو کندھے پر رومال ڈالے ہوئے ترکاری منڈی میں نظر آئے گا جہاں اس کی تمام توجہ شلجم اور پرول کی جانب مبذول ہوگی۔ منڈی سے ترکاری لے کر واپس ہوتے ہوئے بنئے کی دکان اس کا دوسرا اسٹیشن ہوگا اور وہاں سے ایک ہی رومال میں مختلف پوٹلیاں باندھے ہوئے اور ایک ہاتھ میں کوڑا لئے ہوئے جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف تیز قدم اٹھائے گا، اس وقت بھی اس کے دماغ میں سوائے اس کے اور کوئی فکر نہ ہوگی کہ آٹھ بج چکے ہیں، ابھی اسپتال جانا ہے، پھر کھانا کھانا ہے، پھر ٹھیک وقت پر دفتر پہنچنا ہے۔ چنانچہ گھر پہنچتے ہی تمام سودا بیوائن کے حوالہ کرکے وہ مختلف چھوٹی بڑی شیشیاں رومال میں باندھے گا، نسخے جیب میں رکھے گا، پھر کسی بچے کی انگلی پکڑے گا، کسی کو گود میں لے کر اسپتال پہنچ جائے گا۔ اسپتال میں بھی بار بار اس کی نظر گھڑی کی طرف ہوگی اور اس کی رفتار کے تناسب سے کمپاؤنڈر کی خوشامد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ لڑکے کی آنکھ میں جلدی سے دوا ڈال دیجئے اور اس لڑکی کا کان دھو دیجئے۔ مجھے دفتر کی دیر ہو رہی ہے۔ لڑکے کی آنکھ میں دوا ڈلوانے اور لڑکی کا کان دھلوانے کے بعد

بیوی کے لئے دوا لینا بھی ضروری ہے ورنہ وہ برا مان جائے گی کہ میرے کلیجہ کی دھڑکن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسپتال سے دواؤں کے خزانہ سے مالا مال لڑکی کو لادے اور لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے جس وقت بابو صاحب گھر پہنچیں گے، اس وقت دفتر جانے میں مشکل سے چند ہی منٹ باقی ہوں گے۔ جلدی جلدی اُلٹے سیدھے دس پانچ لقمے مار کر فوراً دفتر کے کپڑے پہنیں گے، ایک آدھ کش حقّہ کا لیں گے اور بستہ سنبھال کر چھتری بغل میں دبائے اس طرح دفتر کی طرف بھاگیں گے گویا کوئی لاٹھی لئے ہوئے پیچھے آرہا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ کی تمام چہل پہل ان کے لئے قابل توجہ نہ ہوگی۔ اگر کسی نے سلام کیا تو بغیر دیکھے ہوئے جواب دے دیا۔ اگر کسی نے آواز دی تو بہرے بن کر قدم اور تیز کر دیئے۔ اب اگر کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ راستہ میں کیا ہورہا تھا تو آپ اسی طرح کورے نکلیں گے کہ گویا اس راستے سے گذرے ہی نہیں ہیں۔

دفتر میں بابو جی کی شان البتہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے تاہم اگر کوئی اہل معاملہ آگیا تو آپ اپنے کو اس کے نزدیک لاٹ صاحب سے کم ثابت نہیں کرتے۔ خصوصاً جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس شخص کے کاغذات میرے ہی پاس ہیں اور میں ان کو نہایت آسانی کے ساتھ گڑبڑ میں ڈال سکتا ہوں یا اگر چاہوں تو اسی وقت نکال کر برسوں کا کام منٹوں میں کر سکتا ہوں۔ رشوت لینے کا خیال نہ سہی۔ بلا وجہ پریشان کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر اہل معاملہ کا کام نکل جائے تو ان کا کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اہمیت جتانا بھی ضروری ہے اور چونکہ اہمیت اسی طرح جتائی جا سکتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات کو نہایت مہتم بالشان بنا کر پیش کیا جائے۔ لہذا سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو بھی عنقا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً اہل معاملہ نے نہایت خوشامد کے ساتھ کہا ــــ

"بابو جی آپ چاہیں تو چٹکی بجاتے میرا کاغذ نکلوا سکتے ہیں"

بابو جی پہلے تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے اور کوئی جواب ہی نہ دیں گے۔ اس کے بعد جب وہ پھر کہے گا "بابو جی"

تو آپ صرف کاغذ پر نظر جمائے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہیں گے۔ "ہاں ہاں کہہ تو دیا کہ بڑے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے وہ کاغذ"

اہل معاملہ پھر کھیسیں نکال کر کہے گا "بابو جی بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ ذرا مہربانی کر دیں تو کام نکل جائے گا"

بابو جی چشم غلط انداز سے اس کو دیکھتے ہوئے کہیں گے "تم دیکھ رہے ہو کہ میں خالی تو بیٹھا ہوا ہوں نہیں کہ بس تمہارا کاغذ ڈھونڈنے لگوں۔ جب فرصت ہو گی اس وقت پرانے فائل نکال کر تلاش کر دوں گا"

اہل معاملہ خوشامدانہ کہے گا "یہ تو ٹھیک ہی بابو جی مگر بڑی مہربانی ہو گی۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے"

اب بابو جی اس کو جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھیں گے اور اپنے کام میں مصروف رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کٹہرے کے باہر پہلے تو کچھ دیر

تپائی پر بیٹھ کر اونگھے گا۔ اس کے بعد الہامی طور پر اس کے ذہن میں آئے گا کہ بابوجی کو پان کھلانا چاہیے۔ چنانچہ وہ فوراً پان لے کر بابوجی کی خدمت میں حاضر ہو گا۔

"بابوجی! .... یہ پان لے لو"

بابوجی کی نظریں فوراً اس کی طرف اُٹھ جائیں گی اور وہ پان لیتے ہوئے کہیں گے "پان تو ابھی کھا رہا تھا۔ خیر لاؤ"

جب اہل معاملہ کے پان بابوجی کے منھ میں پہنچ جائیں گے تو وہ خود ہی کہیں گے "ابکی تو ہولی، دیوالی سب گذر گئی اور تم ہم کو بھولے ہی رہے"

اہل معاملہ تاسف کے ساتھ کہے گا "کیا کہیں بابوجی کچھ ایسی ہی فکریں تھیں۔ اب بڑے لڑکے کی شادی ہے، جتنی چاہے مٹھائی کھانا"

بابوجی کہیں گے "ابکی کیا کوئی باغ نہیں لیا ہے؟ کیا آموں کی فصل میں بھی سوکھا ہی رہے گا؟"

اہل معاملہ کہے گا "نہیں بابوجی! بھلا یہ کوئی بات ہے۔ تمھارا باغ حاضر ہے۔ چاہے باغ چلو، چاہے گھر پر منگا لو آم"

بابوجی آموں کا معاملہ پختہ کرنے کے بعد کہیں گے "پارسال تو خیر اچار ہی مل گیا تھا، ابکی تو وہ بھی غائب ہی رہا۔ سیٹھ جی تم روز بروز سیانے ہوتے جاتے ہو"

سیٹھ جی اچار کے سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد جب اچار بھیجنے کا وعدہ کرلیں گے تو بابوجی نہایت خلوص کے ساتھ

اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں ان سے پہلے تو کچھ مشورہ کریں گے، اس کے بعد آگاہی پر روپیہ لینے کا تذکرہ چھیڑ کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ سیٹھ جی خود ہی اس کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اگر سیٹھ جی ہوئے کوئی بُدھو اور تیار ہو گئے تو اسی دن ان کا کاغذ ڈھونڈھ دیا گیا اور بابو جی خود ان کے زر خرید غلام نظر آنے لگے اور سیٹھ جی نے ٹال مٹول سے کام لیا تو آموں اور اچار کے وعدہ کے باوجود اور پانوں کے باوجود ان کا کاغذ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر وہ اس وقت ملے گا جب سیٹھ جی کے دوڑتے دوڑتے چھیتھڑے ہو جائیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو، بابو کی دفتری زندگی کے وقار اور ان کے بالحاظ اقتدار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے اور ایسے ایسے خدا جانے کتنے اہل غرض دفتر میں بابو جی کے حضور ناک رگڑتے اور ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود بابو جی کو بھی اس دفتر میں بڑے بابو اور چھوٹے صاحب کے سامنے اسی قسم کی باتیں کرنا پڑتی ہوں۔

دفتر سے واپسی پر بابو جی کا حُلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بغل میں بستہ اور چھتری، سر پر کسی بے ڈھنگے زاویہ سے رکھی ہوئی ٹوپی، ہاتھ میں رومال، باچھوں سے بہا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام نقوش نمایاں۔ مگر دماغ پر زور دے دے کر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بیوی نے دو پیسہ کے چقندروں اور ایک پیسہ کے پانوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا۔ اس لئے کہ خیال یہ بھی ہے کہ اگر وہ چیز یاد نہ آئی تو گھر پہنچ کر پھر

بازار آنا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ شام کے قریب بابو جی لدے پھندے گھر پہنچتے ہیں اور اگر گھر پہنچ کر پھر گھریلو افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ابکی ہرگز مکان دار کو کرایہ اس وقت تک نہ دوں گا، جب تک کہ چھت نہ بنوا دے۔ تمام چھت ٹپکتی ہے اور اگر اس نے واقعی چھت بنوا دی تو کیا کرایہ دینا ہی پڑے گا؟ حالانکہ اگر اس مہینہ کرایہ نہ لیتا تو اچھا تھا۔ اس لئے کہ جوتہ بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بیوی اپنے بھائی کے لڑکے کے مونڈن میں بھی جانا چاہتی ہے، اس کا خرچ الگ ہے۔ لہذا ان تمام باتوں پر ایک ناریل پی کر غور کرنا چاہیئے اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو روٹی کھا کر سو رہنا چاہیئے۔

برقِ تبسّم

موٹرسائیکل

دل میں جب پنکھے لگ جاتے ہیں تو وہ دل عاشق ہو جاتا ہے۔ یہ ترکیب تو سب کو معلوم ہے۔ مگر بے جان کو جان دار بنانے کی بھی ایک ترکیب ہے۔ سائیکل میں انجن لگا دیجئے، بس وہ جان دار ہو جائے گی۔ زوروں پر دھڑکنے لگے گی، مچلنے لگے گی۔ وہ دھڑکتی تو ایسا ہے کہ اچھا خاصا آدمی اسے سن کر "نجدی" ہو جائے اور سرزمین نجد تک تو جنگ کی وجہ سے پہنچنا مشکل ہو گیا ہے مگر ہاں یہ دھڑکن اُسی مقابلے کی دوسری سرزمینوں کا طواف کرنے پر ضرور مجبور کر دے۔

پٹرول کی کمی نے انسان کے حیات و جذبات کو بُری طرح مجروح کیا ہے۔ عاشقوں کی موٹریں یا تو گراج میں بند ہیں یا پھر میدان جنگ میں لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنے میں مصروف ہیں اور یہ بیچارے نوجوان پھٹے رکشوں، سائیکلوں یا پھر اپنی ٹانگوں پر ہی نعرہ ہائے عشق لگاتے نظر آتے ہیں۔ پیدل چلتے چلتے تھک جاتے ہیں تو درد فراق جھیلا نہیں جاتا اور اس فراق میں انھیں "فراقؔ" ہی یاد آتے ہیں۔ ہمارے ایک "پیدل شاہ نجد"

تھک کر چور ہونے کے بعد فراق کو یاد کر رہے تھے ۔

میں رنگ و بوئے محبت کی نرمیاں ہوں فراقؔ
کسی کے نازو نزاکت سے کھیل سکتا ہوں

مگر بُرا ہو زمانے کا کہ اس نازو نزاکت کے کھیل کے لئے عین وقت پر ملک میں پٹرول گھٹ گیا۔ لیکن اگر شباب کے ساتھ خوش قسمتی ہو اور خوش قسمتی کے ساتھ موٹر سائیکل اور پٹرول ہو تو پھر زندگی بڑی پُر لطف اور جینے کے لائق ہو جاتی ہے ۔ زیادہ نہیں، آج سے دو سال قبل کالج میں تقریباً پندرہ بیس موٹر سائیکلیں دھڑکتی نظر آتی تھیں مگر آج صرف ان کی ہلکی سی یاد باقی ہے۔

نادر شاہ نے دلّی میں قتل عام کیا تھا۔ مگر یہاں پٹرول راشننگ نے قتل عام نہیں بلکہ قتل خاص کر دیا۔ جنگ کے پہلے برسات کے مچھروں کی طرح موٹر سائیکلوں کی تعداد ان گنت تھی لیکن اب کوئٹہ کی زلزلہ کی تباہی کی طرح ان کی آبادی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے دل کے ساتھ سائیکلیں بھی دھڑکا کرتی تھیں، مگر آخر وہی دل لوگوں کے کام آیا جس نے ایک زمانہ میں ایران و ہندوستان میں واویلے مچائے تھے اور لے دے کر وہی بیچارہ ہے جو دنیا و مافیہا، جنگ و صلح، پٹرول اور راشننگ سے بے نیاز ہو کر دھڑکے چلا جاتا ہے۔

ہمارے کالج میں بہت سی موٹر سائیکلیں تھیں مگر اب لے دے کر اللہ کے نام کے ساتھ بس ایک ہی رہ گئی ہے ۔

کالج کے وقت پٹنہ کے محبوب انتہائی مشرقی گوشہ سے یہ سائیکل آفتاب امید کی طرح طلوع ہوتی ہے اور کالج کے دروازہ میں اسی طرح داخل ہوتی ہے جیسے جنگ ٹیونیشیا کے بعد الکزنڈر باب الفتح میں داخل ہوا تھا۔

ان سائیکلوں سے دل چسپ رومان وابستہ ہوتے ہیں۔ کبھی کسی معقول سی موٹر کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اکثر پیچھا کرتے کرتے سائیکل سوار آگے نکل جاتا ہے۔ کار بیچاری آگے نکلنے کی کوشش کرتی ہے مگر سائیکل سوار سڑک پر اسی شان سے فراٹے بھرتا ہو جیسے کہ یہ گرینڈ ٹرنک روڈ ہو اور وہ خود شیر شاہ کا کوئی قریبی رشتہ دار۔ اسی طرح اسی سائیکل کے ذریعہ ایڈونچر بھی کیے جاتے ہیں۔ مجھے خود ایک دل چسپ واقعہ یاد ہے۔ میں ان دنوں غالباً دسویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اسکول سے فوراً ہی چھٹی ہوئی تھی اور میں آہستہ خرامی کرتا ہوا گھر کی طرف آرہا تھا۔ سامنے دور پر ایک موٹر سائیکل چمکی اور پھٹا پھٹ کرتی ہوئی تیزی سے آگے آتی گئی۔ ایک دیہاتی بیچارہ زمین پر اپنی گٹھری رکھ کر سڑک کے کنارے ذرا دم لینے بیٹھا تھا۔ سائیکل سوار کی نظر دیہاتی پر پڑی اور وہاں سے پھسل کر اس کی گٹھری پر۔ پھر کیا تھا، رفتار کم ہوئی؛ نزدیک پہنچتے ہی اس مسخرہ نے ایک ہاتھ سے گٹھری اٹھالی اور سائیکل یہ جا اور وہ جا۔ دیہاتی بیچارہ کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔ میں اُس کے پاس پہنچا اور اپنی مکمل ہمدردی کا یقین دلایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس گٹھری میں تھوڑی سی کھٹائی اور ستّو کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سائیکل سوار نے

دیہاتی کی آنکھوں میں خاک ڈالی اور دیہاتی نے ستّو۔ میرے خیال میں پلّہ برابر ہونے میں بہت ہی تھوڑا فرق رہا۔ یہ بات تو طے ہے کہ خاک بھی سفوف ہے اور ستّو بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک آنکھوں میں جھونکا جاتا ہے اور دوسرا مُنھ میں۔ سفوف ہاضم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں، دُبلے پتلے سے۔ قدیم عظیم آباد کے صحیح نمائندے۔ ان کے پاس ایک سائیکل ہے جو "علم سینہ بہ سینہ" کے قاعدہ پر غالباً "اوپر" سے چلی آ رہی ہے۔ اس سائیکل کو اپنے سوار کا انجر پنجر ڈھیلا کر دینے میں خاص کمال حاصل ہے۔ اکثر چلتے چلتے یہ تھم جاتی ہے اور کبھی کبھی چیخ چیخ کر رُک جاتی ہے۔ غرض منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے کبھی اس کا سانس پھولتا ہے اور کبھی اس پر فالج گر جاتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر اسی سائیکل کے ہاتھوں ہمارے دوست نے بہت زک اٹھائی ہے اور اکثر مرثیہ کے انداز میں انھیں بڑے ضبط سے "دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا" پڑھنا پڑا ہے مگر انھیں اپنی سائیکل اتنی پیاری ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کا نام نہیں لیتے — اور دو چار ہاتھ کیا، اگر لبِ بام میلوں دور بھی رہ جائے تو انھیں کوئی پرواہ نہیں۔ بس سائیکل ان کے پاس رہنی چاہیے۔

کئی دفعہ یہ ہوا کہ پوری رفتار سے کسی کے پیچھے اُڑے جا رہے ہیں کہ یک بیک بیمارِ غم کو ہچکی آتی ہے، سائیکل کو سکتہ لگ جاتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود وہ "قطب از جانمی جنبد" ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گرم

سائیکل ٹھنڈی ہوتی ہے، امیدوں پر اوس اور ریس میں شکست۔ یہ ہوتا ہے اس دوڑ کا ماحصل۔ غصّہ آتا ہے، ناچ جاتے ہیں، مگر دو تین میل سائیکل ڈھکیلنے سے چھٹکارا نہیں ملتا اور اس پر بھی وہ سائیکل ان کی اپنی ہے اور اس سے انھیں محبت اور وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ غنیمت ہے ان کی سائیکل کا دم کہ جس کے بل بوتے پر کبھی رومانس اور کبھی ایڈونچر کا سامنا ہو جاتا ہے اور یہ سبھوں کو معلوم ہے کہ اگر ایڈونچر اور رومانس کا ساتھ ہو تو زندگی "چناجور گرم" کی طرح چٹ پٹے دار ہو جاتی ہے اور آپ جانئے سائیکل سواروں کے ایک ہاتھ میں رومانس اور دوسرے میں ایڈونچر ہوتا ہے اور زندگی بھُنتے ہوئے چنے کی طرح سائیکل پر پھٹا پھٹ کرتی رہتی ہے۔

ترنگ

چھینک

دُنیا میں سات عجائبات تو مشہور ہیں مگر آٹھویں عجیب چیز کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور اس عدم توجہی کی وجہ وہی "چراغ تلے اندھیرا" ہے۔ یہ آٹھویں چیز اتنی عام ہے کہ اس کی طرف خیال کا جانا ذرا مشکل ہی کام ہے۔ انتظار کی تکلیف دیئے بغیر میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ دنیا کی یہ آٹھویں عجیب چیز "چھینک" ہے۔ اس چھینک سے ایسے ایسے عجائبات اور معجزات ظہور میں آتے ہیں کہ انسان حیرت کرنے لگتا ہے۔ چھینک کا ذکر آتے ہی ہنسی آجاتی ہے اور ہنسی اس لئے آتی ہے کہ ریل کے سفر میں سیٹھ جی کا واقعہ خیال آجاتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے۔ چھینک ہی کی وجہ سے یارائے ضبط نہ رہا اور کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چھینک آتی ہی کیوں ہے؟ اگر یہ سوال آپ طبی طرح پر کریں گے تو میں کہوں گا کہ ناک میں کچھ کیڑے ہوتے ہیں اور جب ان کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے یا ان کی مجلسِ حال وقال منعقد ہوتی ہے تو چھینکیں آتی ہیں۔ یہ کیڑے بھی تو آخر جاندار ہوتے ہیں۔ ان کے بھی دل ہوتا ہے اور اس دل میں امنگیں

ہوتی ہیں۔ جب کبھی ان امنگوں نے زور کیا، آپ کو ایک آدھ چھینک آ گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ہندوستان کو اتنی چھینکیں آئیں کہ وہ بے حال ہو گیا اور اِس وقت تک اُس تباہ حالی کے اثرات ختم نہ ہو سکے ہیں۔ اگر ان کیڑوں کے درمیان غدر مچتا ہے تو پھر آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس کا نتیجہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی طرح آپ بھی بے حال ہو جاتے ہیں اور جس طرح غدر کے بعد سلطنت تیموری نے دم توڑ دیا تھا اور انگریز سریر آرائے حکومت ہوئے تھے، اُسی طرح آپ کی تندرستی وقتی طور پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ زکام آپ پر قبضہ جما تا ہے اور اکثر تو زکام سے شروع ہو کر نمونیا تک ہو جاتا ہے۔ بات صاف ہے۔ ان کیڑوں میں غدر مچا کر زکام اپنا استقبال چھینکوں سے کراتا ہے۔ یہ تو طبّی سوال کا طبّی جواب ہے۔ آپ پوچھیں گے غیر طبّی جواب کیا ہے؟ سُنئے! چھینکیں صرف اس لئے آتی ہیں کہ آپ کو تنگ کریں، خواہ مخواہ ہی کسی کام میں روڑا اٹکائیں یا پھر آپ کو کچھ گھڑکیاں سُنوا دیں۔

مشاعرہ ہو رہا ہے۔ حفیظ جالندھری نے "ابھی تو میں جوان ہوں" والی نظم شروع کی۔ ابھی "ساقیا" پر انھوں نے تان لگائی ہی تھی کہ آپ کو چھینک آ گئی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہ کتنی بے موقع بات ہے۔ پاس والے آپ کو انتہائی غیظ و غضب کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے۔ آپ نے ان کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

اسی طرح سینما میں "زندگی" فلم دکھایا جا رہا ہے۔ سیگل کی دل کش موسیقی سے ہال گونج رہا ہے۔ جس وقت اس کا بہترین گانا شروع ہوا، اسی وقت کیڑوں نے آپ سے غداری کی اور اندولن مچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو مسلسل چھینکیں آنا شروع ہوئیں۔ اب لوگ آپ کا تماشہ دیکھیں یا فلم کا۔ آپ اس وقت انتہائی تکلیف اور ذلت محسوس کرتے ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتے۔ غصہ میں ناچ جاتے ہیں پر ناک کے اندر کیڑوں کا ناچ نہیں رکتا۔ ناک مسلتے مسلتے پھول کر ٹماٹر ہو جاتی ہے مگر صبر کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہیں۔

چھینک کبھی کبھی "تائیدِ غیبی" بن کر بھی آتی ہے۔ آپ کی کوئی چیز چوری کرنے کی نیت سے کوئی ذات شریف کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسی اثنا میں کہیں آپ آ جاتے ہیں۔ کام ادھورا چھوڑ کر "دبک" جانے کی سخت ترین ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ پردے کے پیچھے یا پلنگ کے نیچے، غرض جیسا موقع ہوا، یہ ذات شریف چھپ جاتے ہیں۔ چھپنے کے بعد کافی اطمینان ہو جاتا ہے۔ گرچہ ڈر کی وجہ سے دل میں پنکھے لگے رہتے ہیں۔ مگر یکبارگی چھینک کی روح فرسا ٹریجڈی رونما ہوتی ہے۔ چور صاحب چھینکتے ہیں اور اس طرح حوالات کے دروازہ کو اپنے لئے وا کر دیتے ہیں۔ آپ کے لئے تو یہ چھینک تائیدِ غیبی ہوئی مگر بیچارے چور کے لئے آفتِ عظیم۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹی کے لئے یہ رحمت بن کر آئے۔ کبھی کبھی

چھینک خاصا مزہ دے جاتی ہے۔ مدّتوں کی تمنائے ملاقات بر آتی ہے۔ پچھلی رات کا سنّاٹا ہے۔ گھر میں سب سوئے ہیں۔ "چوری چھپے" کی ملاقات کا اس سے بڑھ کر کوئی وقت نہیں ۔۔ اور آپ جیسا وقت سے فائدہ اٹھانے والا بھلا کیوں کر چوک سکتا ہے۔ یہ ملاقات صحن ہی کے کسی کونے میں شروع ہوتی ہے۔ مگر ابھی اس اندھیرے میں آپ جی بھر کر انھیں دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ کی ناک آپ سے بے پناہ غدّاری کا ثبوت دیتی ہے۔ پھر کیا ہے، کسی کی آنکھ کھُل جاتی ہے اور کوئی نیند میں کسمساتا ہے اور آپ دونوں دبے پاؤں اس طرح بھاگتے ہیں کہ کیا شیطان لاحول سے بھاگے گا۔ غرض یہ ہیں چھینک کی ستم آرائیاں جو وقت وصل طبل جنگ کا کام کرتی ہیں۔

طالب علموں کے لیے تو چھینک اکثر خاصی مصیبت ہو جاتی ہے۔ کلاس میں پروفیسر پڑھا رہا ہے اور آپ ہیں کہ چھینکے جا رہے ہیں۔ پروفیسر کو تو اس نازیبا حرکت پر غصّہ آتا ہی ہے مگر آپ کے ساتھی بھی بہت چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور کہیں یہ چھینک مسلسل جاری رہی تو پھر تمام بے چین نگاہیں شدّت سے آپ کے اخراج کا انتظار کرتی ہیں اور جبتک آپ "کلاس بدر" نہ کر دیئے جائیں کوئی چین نہیں لیتا۔ یہ ذلّت صرف چھینک کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑتی ہے۔

سنتے ہیں جنت میں ہر طرح کے آرام ہیں اور کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں۔ اگر کہیں وہاں چھینک کا وجود ہوا تو بے حد مشکل کا سامنا ہوگا۔ نہ شعر و شاعری ہی ٹھیک سے ہو سکے گی اور نہ حور و غلمان کی صحبت ہی کا لطف اٹھایا جا سکے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو چھینک کسی بڑی سزا سے کم نہیں ــ اور جب یہ سزا ٹھہری تو پھر جنت میں اس کا کیا کام۔ اس کے لئے تو سب سے بہتر جگہ دوزخ ہے۔ ہلکے گناہوں کی سزا صرف چھینک رکھی جائے تو وہ پاداش کے لئے کافی ہے۔ چھینکتے چھینکتے ملزم کا دیوالہ نکل جائے بلکہ موت تک صادر ہو جاسکتی ہے۔

حکومت نے "اندولن" والے قیدیوں کو بیکار بند کر رکھا ہے اور ان کی ذات پر فضول اتنا روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ ان کی بہترین سزا تو یہ تھی کہ کسی دوا کے ذریعہ سو ہزار چھینکیں دلوا دی جاتیں۔ پھر دیکھتی حکومت تماشہ۔ زندگی بھر وہ "اندولن" کا نام نہ لیتے بلکہ قسم وفاداری تک کھا لیتے۔ یہاں "رگن پاوڈر" سے زیادہ اہمیت ناس کی ہے مگر یہ اہم معاملہ حکومت تک پہنچائے کون؟ اور پھر سرکار اتنی عقل مند ہوتی تو یہ ساری آفتیں ہی کیوں پیدا ہوتیں؟ بدامنی کے ہنگاموں میں تمام آنسو والی گیس استعمال کی گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ بدامنی اور قانون کی خلاف ورزی رک تھوڑی ہی گئی۔ لاہور میں خاکساروں پر گیس استعمال کی، گولی برسائی مگر اس سے کیا ہوا؟ خاکسار تحریک ختم ہو گئی؟ اگر چھینک کی کوئی گیس تیار کی جائے اور ایسے

موقعوں پر اسی کا استعمال ہو تو یقین ہے کہ سو فیصدی کامیابی ہو گی۔ پیسوں کی علیحدہ بچت ہے اور کامیابی کی الگ ضمانت — اور ایک فائدہ ہو تو کوئی سمجھائے بھی، ہزاروں کہاں تک بتائے جائیں۔

طبیبوں کا خیال ہے کہ چھینک کے قبل چہرے پر ایک خاص کیفیت "مروڑ" کی نمایاں ہوتی ہے۔ آپ کو اس بات میں کوئی شک نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ "مروڑی" کیفیت خود آپ پر ہزاروں بار گذر چکی ہو گی۔ ذرا غور تو کیجیے کہ چھینک آنے کے قبل آپ کے چہرہ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ کوئی خط بھی اپنی جگہ درست رہتا ہے؟ کہیں زاویہ قائمہ بنا ہوتا ہے اور کہیں زنبجے کون اور وہاں اقلیدس کی وہ وہ شکلیں بنتی ہیں جو اقلیدس ایجاد کرنے والے کے خیال میں بھی کبھی نہ آئی ہوں گی۔ اب حالت ذرا ترقی کرتی ہے اور اس "ٹوپوگرافی" کے ساتھ آپ کے ناک کی ستم ظریف گدگدی تیز ہوتی ہے اور آپ کے دونوں جبڑے "ابوالہولی" انداز میں ایک دوسرے سے فرقت اختیار کرنے لگتے ہیں اور عروج اس وقت ہوتا ہے جب پھولی ہوئی ناک، بگڑے ہوئے چہرے اور شمال و جنوب کی انتہائی سرحد پر پہنچے ہوئے دونوں جبڑوں کے ساتھ آپ چھینک کا انتظار کرتے ہیں۔ اکثر وہ وفاداری کے ساتھ وقت پر آجاتی ہے اور کبھی بیوفائی پر تلتی ہے تو چہروں کا جغرافیہ بگاڑتی رہتی ہے۔ مگر آنے کا نام نہیں لیتی۔

جنگ کے اختتام پر جب ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی قید ہو جائیں گے اور میری رائے پر عمل کر کے انھیں چھینکیں دلوائی جائیں گی، تو کتنا مزہ آئے گا۔ بے چارہ گول مول ٹوجو مارے چھینکوں کے پریشان و بدحال، پنکچر ہوتے ہوئے فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوگا۔ ہٹلر جو اپنی مونچھوں کے بل بوتے پر دنیا کو اپنے ہتھیاروں کے سائے میں بلاتا تھا، اب چھینکوں کے سائے میں نمرود کو یاد کر رہا ہوگا اور پولینڈ و فرانس کی بجائے اس کی ناک میں جو معرکہ کارزار گرم ہوگا، اُس سے نجات ناممکن نظر آئے گی۔ اب رہا مسولینی کا معاملہ تو اس کی "عظیم الشان توند" ہزار چھینکوں کے بعد ہی بے چاری "دکھیا توند" بن کر رہ جائے گی۔ اور ناک؟ وہ غریب تو پہلے ہی کٹ چکی تھی، رہی سہی بھی چھینکوں کی نذر ہو جائے گی۔ تو جناب یہ ہے چھینک جو مونچھ کو چھوڑتی ہے اور نہ توند کو اور اچھے خاصے آدمی کو فٹ بال بنا دیتی ہے۔

چھینک کے آنکھیں تو ہوتی نہیں جو دیکھ بھال کر اور موقع کی نزاکت کا خیال کر کے آئے۔ اگر اُس کے آنکھیں ہوتیں تو میں کسی چشمہ کمپنی سے اُسے چار آنکھیں لگوا دیتا۔ دیکھیے میں کتنی سنجیدگی سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں مگر "چھینک" اس بات پر تلی گئی ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہ لکھوں۔ حملہ شروع ہو چکا ہے اور میں نہتّا اس کا مقابلہ کرنے سے رہا۔ یہی ایک ایسی آفت ہے، جس سے مقابلہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں۔ یہ میری تیسری چھینک تو اتنی زور سے

آئی جیسے کہہ رہی ہو ع

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے

یہ شاید لکھائی بند کرنے کا آخری سگنل تھا۔

دیکھا آپ نے؟ اس "مختصر" سی چھینک کے سامنے ساری "اشرف المخلوقیت" دھری رہ جاتی ہے۔ تو بیچارہ سیٹھ جی کا بس نہ چلا تو کون سی بُری بات نکلی۔ لیکن لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ ہنس دیتے ہیں۔

ترنگ